قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ———

ٹیلیفون : ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون : ثریا عندلیب

ناشر : شیخ عبدالحمید

طابع : خالد منصور نسیم

مطبع : النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۲۷۵۸۲۶

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۳ ——— اپریل ۱۹۹۰ء ——— شمارہ ۴

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۶۰ روپے

بیرونی ممالک ——— (بذریعہ سمندری ڈاک) ۱۲۵ روپے

فی پرچہ : -/۵ روپے

فہرست مضامین

۱۔ لمعات ——— ادارہ ——— ۳

۲۔ دو قومی نظریہ سے ہمارا مذاق ——— اعزاز الدین احمد ——— ۷

۳۔ تحریکِ پاکستان ——— ڈاکٹر صلاح الدین اکبر ——— ۱۹

۴۔ تحریکِ پاکستان ——— پیرزادہ محمد انور چشتی ——— ۳۱

۵۔ تحریکِ پاکستان ——— بشیر احمد عابد ——— ۳۸

۶۔ تحریکِ پاکستان ——— قمر پرویز ——— ۴۳

۷۔ تحریکِ پاکستان ——— عارفی سلطانہ ——— ۴۹

۸۔ تحریکِ پاکستان ——— غلام رسول ازہر ——— ۵۷

۹۔ AN EXERCISE IN SELF ANALYSIS ——— شمیم انور ——— ۸۰

انتساب

طلوع اسلام حکیم الامت، علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی یاد میں شائع ہو رہا ہے اور اس کا مقصد ان کے پیام حیات آفریں کی نشر و اشاعت ہے۔ اس لئے اس کا ہر نمبر اقبالؒ نمبر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے آج تک کوئی اقبالؒ نمبر شائع نہیں کیا۔ بایں ہمہ یہ پرچہ چونکہ اپریل سے متعلق ہے جو علامہ اقبالؒ کی وفات کا مہینہ ہے اور اس پرچہ میں مرقوم داستان ہے جادۂ مستقیم پہ گامزن اس کاروانِ ملت کی جس کی تنہ میل خود حضرت علامہؒ نے فرمائی تھی لہٰذا طلوع اسلام کا یہ شمارہ جسے "قرارداد پاکستان گولڈن جوبلی نمبر" کا نام دیا گیا ہے حضرت علامہؒ کی نذر ہے۔

طلوع اسلام اشخاص پرستی میں یقین نہیں رکھتا اس لئے جب یہ اپنے آپ کو اقبالؒ سے منسوب کرتا ہے تو اس سے مراد ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بار ایٹ لاء نہیں جو سیالکوٹ میں پیدا اور لاہور میں دفن ہوئے بلکہ اس سے مقصود اقبالؒ کا وہ پیغام ہے جس نے اس مردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دیا اور راہ گم کردہ کاروانِ ملت کو از سرِ نو نشانِ منزل سے آگاہ کر دیا۔ پھر اس پیغام سے بھی ہمیں صرف اس لئے دلچسپی ہے کہ یہ درحقیقت قرآن کا پیغام ہے جسے اقبالؒ نے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔

اس لئے پیغام اقبالؒ کی نشر و اشاعت سے ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ اس طرح مسلمانوں کو قرآن کے قریب لایا جائے اور انہیں اس چشمۂ حیات سے از سرِ نو متعارف کرایا جائے جس میں حقیقی زندگی کا راز مستور ہے۔ لہٰذا اقبالؒ ہمارے نزدیک مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک مقصدِ عظیم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ نہایت کامیاب، جاذب اور دلکش ذریعہ۔ خود اقبالؒ کے الفاظ میں:

غزل سرائم و پیغام آشنا گویم — بایں بہانہ دریں بزم آشنا جویم

لمعات

قراردادِ پاکستان

بارہا گفتہ ام و بارِ دگر می گویم

غیر منقسم ہندوستان کی مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں قراردادِ لاہور منظور کی۔ اس قرارداد میں برِّصغیر کی سیاسی و آئینی مشکلات کا واحد حل "تقسیم" تجویز ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں مدراس کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ نے سابق موقف بدل کر اسے قراردادِ حصولِ پاکستان قرار دیا۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں ہندوؤں کا دعویٰ یہ تھا کہ اس ملک میں بسنے والے تمام لوگ، بلا تخصیصِ مذہب و ملّت، ایک قوم کے افراد ہیں۔ اس لئے یہاں ایک "قومی حکومت" قائم کرنی چاہیئے جو جمہوریت کے اصول پر کارفرما ہو۔ بعض مسلمان بھی ایسے تھے جو اس نظریۂ "متحدہ قومیت" میں ہندوؤں کے ہم نوا تھے۔ انہیں نیشنلسٹ مسلمان کہا جاتا تھا۔

دوسری جماعت مسلم لیگ کی تھی جس کا ادعا یہ تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک قومیت کا مدار اتّحادِ وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔ تمام مسلمان، بہ حیثیت مسلمان، ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں اس لئے وہ کسی دوسرے مذہب کے پیروؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قوم نہیں بن سکتے۔ ہندوستان میں نظامِ جمہوریت کے معنی یہ ہوں گے کہ یہاں اکثریت کی حکومت ہو اور اکثریت چونکہ ہندوؤں کی ہے۔ اس لئے آزادیٔ ہند سے مفہوم ہوگا ہندوؤں کی حکومت اور مسلمانوں کی محکومیت۔ ان کے نزدیک اس گتھی کا عملی حل یہ تھا کہ ہندوستان کے ان علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، الگ کر کے مسلمانوں کی جداگانہ حکومت قائم کی جائے۔ یہ تقسیمِ ہند کا نظریہ تھا جس کی مخالفت ہندو اور ان کے ہم نوا مسلم نیشنلسٹ حضرات کرتے تھے۔

دورانِ تحریک میں ایک تیسری آواز اٹھی جس نے یہ کہا کہ بے شک مسلمان، ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قوم نہیں بن سکتے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان، محض پیدائشی مسلمان ہیں جن کا مسلمان ہونا کوئی

حقیقت نہیں رکھتا۔ انہیں پہلے سچے معنوں میں مسلمان ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد آزادی کے طالب، پیدائشی مسلمان، انگریز یا ہندو کے غلام رہیں تو کیا اور اپنی الگ حکومت قائم کر لیں تو کیا۔ ان کی آزادی صحیح معنوں میں آزادی اسی صورت میں کہلا سکتی ہے جب یہ اپنے اندر اسلامی صفات پیدا کریں۔ اس نظریہ کے مدعیان نے اپنے آپ کو "اسلامی جماعت" کے نام سے متعارف کرایا۔

طلوعِ اسلام اس حد تک اسلامی جماعت کے ساتھ ہم نوا تھا کہ مسلمان صرف اسی صورت میں آزاد کہلا سکتا ہے جب یہ اپنی مملکت میں خدا کا قانون رائج کرے۔ لیکن اس کا مسلک یہ تھا کہ خدا کے قانون کو رائج کرنے کے لئے کسی خطّۂ زمین کی ضرورت ہے جب تک ہم ہندوستان میں کسی خطّۂ زمین کے مالک نہیں بن جاتے اس وقت تک حکومتِ خداوندی کے قیام کا امکان نہیں۔ لہٰذا مسلم لیگ کی تحریکِ تقسیم ہندوستان کو کامیاب بنانے کے لئے ہمیں پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ اس کی کامیابی سے ہمیں وہ امکانی قدرت حاصل ہو جائے گی جس سے اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھ سکے۔ اگر ہم نے اس وقت تغافل برتا تو انگریز، پورا ہندوستان، ہندو کے سپرد کر دے گا جس سے ہمیں یہ امکانی قدرت حاصل نہ ہو سکے گی ہمیں مسلم لیگ کی اس سیاسی تحریک کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو قرآن کے قریب لانے کی کوشش بھی جاری رکھنی چاہیئے۔

لیکن "اسلامی جماعت" کے نزدیک یہ مسلک قابلِ قبول نہ تھا۔ وہ "پیدائشی مسلمانوں" کے قومی اور اجتماعی مطالبات سے ہم آہنگی اور تعاون کو اسی طرح تعاون علی الاثم والعدوان (گناہ اور سرکشی کے معاملات میں تعاون) سمجھتی تھی، جس طرح مرزائی حضرات مسلمانوں سے روابط قائم کرنے میں کفر و فسق محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اس جماعت نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی اس تحریک سے عملاً الگ رکھا اور دوسروں کو اس سے الگ رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل، مسلمانوں کی اس اجتماعی تحریک کے لئے نیشنلسٹ مسلمانوں سے بھی کہیں زیادہ ضرر رساں تھا۔ اس لئے کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے نظریۂ متحدہ قومیت کا بودا پن عوام کو بآسانی نظر آ جاتا تھا لیکن ان کا یہ اندازِ گفتگو کہ "جب تک مسلمان اپنے آپ کو سچے معنوں میں مسلمان نہیں بنا لیتا، جب تک یہ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں نہیں رنگ لیتا۔ اس وقت تک انہیں کوئی فوز و فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے قومی لیڈروں کو دیکھو! ان میں کوئی اسلامی خصوصیت نظر نہیں آئے گی ان کا فکر مغربی ٹکسالوں میں ڈھلا ہوا۔ ان کا عمل کفار اور مشرکین سے ملتا ہوا۔ کون سچا مسلمان ہے جو ان کی قیادت میں چلنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھے گا؟ اگر مسلمان اپنے اندر قوتِ ایمان پیدا کر لے گا تو دنیا کی کوئی قوت اسے محکوم نہیں بنا سکے گی لہٰذا ان ہنگامی تحریکوں کو چھوڑ دو۔ اور مسلمان بننے کی کوشش کرو۔" عوام پر اپنا اثر کر جاتا تھا اور وہ بھول جاتے تھے کہ اس

دلیل اور اس نتیجہ میں جس تک یہ جماعت ہمیں پہنچاتی ہے، کوئی ربط نہیں۔

بہرحال وہ دور ختم ہوا اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے نظریۂ متحدہ قومیت اور جماعتِ اسلامی کے مسلکِ اعتزال کے باوجود مسلمانوں کو ایک خطۂ زمین مل گیا۔

دوسروں کے لئے یہ خطۂ زمین شاید اس لئے عزیز ہو کہ یہاں انہیں جان ومال کی سلامتی کا گوشہ یا ان کی خوشحالیوں اور ترقیوں کا ذریعہ مل گیا لیکن طلوعِ اسلام کے نزدیک پاکستان اس سے کہیں زیادہ عزیز تر ہے اس لئے کہ اس کے تصورات کے مطابق یہی وہ سرزمین ہے جہاں ہمیں یہ امکانی قوت حاصل ہے کہ ہم چاہیں تو اس میں قرآنی نظام کو پھر سے مشہود صورت میں سامنے لے آئیں جو نوعِ انسانی کی فلاح وسعادت کا موجب بنے۔ مصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ نے جب ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو اس کا مقصد یہی بتایا تھا کہ اس سے مسلمان اس نہج کی زندگی بسر کرنے کا امکان حاصل کر لیں گے جو اُن کے لئے ان کے خدا نے متعین کی ہے اور جسے آج سے چودہ سو سال پہلے ان کے رسولؐ نے متشکل کر کے دکھا دیا تھا۔ طلوعِ اسلام اس پیغامِ حقیقت کشا کا نقیب اور اس انسانیت ساز دعوت کا علمبردار ہے اس کے نزدیک سرزمین پاکستان عزیز ترین متاعِ حیات ہے۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جس کے تحت طلوعِ اسلام نے **قیامِ پاکستان** کی گولڈن جوبلی منانے میں پہل کی ہے ۲۳ فروری ۱۹۹۰ کو واپڈا آڈیٹوریم میں بصورت "طلوعِ اسلام سیمینار" منائی جانے والی گولڈن جوبلی تقریب کی روئیداد اگرچہ سابقہ شمارے میں شائع ہو چکی ہے لیکن ملک کے طول وعرض اور دیارِ غیر سے آئے ہوئے مندوبین کے وہ خطبات جو آڈیٹوریم میں موجود سامعین کے لئے وجۂ ارتعاشِ قلوب واذہان ہوئے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔ احباب کی دلی تمنا تھی کہ وہ تمام خطابات یکجا شائع کئے جائیں تاکہ ایک تو اُن تک دسترس عام ہو جائے اور دوسرے ہماری نژادِ نو کو معلوم ہو سکے کہ ہم نے پاکستان کس لئے حاصل کیا تھا۔

ہمیں امید ہے اس مجموعہ کا حلقۂ طلوعِ اسلام کے باہر بھی دلچسپی سے مطالعہ کیا جائیگا اس سے جہاں قارئین کو تحریک پاکستان کا صحیح صحیح تعارف حاصل ہوگا وہاں ان غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہو جائے گا جو اس کے خلاف دیدہ ودانستہ پھیلائی جا رہی ہیں۔ افادیت سے قطع نظر امید ہے کہ ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی قارئین ان خطابات میں اپنے بلند اور شستہ ذوقِ سلیم کی تسکین کا سامان پائیں گے۔

گہر ہائے تابدار

رسول اللہ نے وفات کے وقت کچھ نہیں چھوڑا۔ نہ درہم نہ دینار۔ نہ غلام نہ لونڈی نہ کوئی اور شئے۔ صرف اپنا سفید خچر اور ہتھیار۔ اور کچھ زمین جسے عام مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا۔

(بخاریؒ)

پاکستان کے مسلمانو!

تم نے ابھی تک کشمیر کی اہمیت کا غالباً صحیح صحیح اندازہ نہیں کیا۔ تم نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ یہ لڑائی بھارتی فوج اور مجاہدینِ کشمیر کی ہے۔ حالانکہ یہ جنگ براہ راست تمہارے خلاف ہے۔ کشمیر کی حفاظت تمہاری اپنی حفاظت ہے۔ تمہارے بال بچوں کی حفاظت ہے، تمہاری عزت و ناموس کی حفاظت ہے۔ تمہارے جان و اموال کی حفاظت ہے۔ تمہاری تہذیب و معاشرت کی حفاظت ہے۔ ہر اس شے کی حفاظت ہے جو تمہیں عزیز ہے۔ پھر حیرت ہے کہ اس کے باوجود تم نے اسے اوروں کی جنگ سمجھ رکھا ہے۔ ہندو کے عزائم بڑے مشؤم اور اس کی تدابیر بڑی دور رس ہیں۔ تمہارے کشمیری بھائیوں نے اس وقت تک اپنے خون کی قیمت سے ان کے ارادوں کو مٹی میں ملائے رکھا ہے۔ لیکن وہ تنہا اس سیلاب کا مقابلہ کب تک کر سکیں گے؟ ہو سکتا ہے کہ حکومت پاکستان اس باب میں بین الاقوامی قوانین و مصالح سے مجبور ہو لیکن تمہیں تو کوئی مجبوری نہیں ہے۔ تمہارے بھائیوں کو تمہاری ہر قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔ اب تم انگریز کے غلام نہیں ہو کہ تمہاری تگ و تاز فقط جلوس اور ہڑتال تک محدود ہے۔ اب تم آزاد مسلمان ہو۔ اٹھو! اور باہم ملکر ایسی متحدہ آواز بلند کرو کہ دنیا کی قومیں عدل و انصاف پہ مجبور ہو جائیں۔ اگر وہاں استصواب کی صورت پیش آئے تو وہاں کے مسلمانوں کو ایسی سہولتیں بہم پہنچاؤ کہ ہر شخص اپنے ضمیر کی آواز مقام متعلقہ تک پہنچا سکے۔ خدا کے لئے باتیں کم کرو۔ کام زیادہ کرو۔

اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہو گی!

نوجوانوں کے لئے فکر و نظر کی نئی راہیں

سلیم کے نام

از پرویز

خطاب۔ اعزالدین احمد خاں

حصولِ پاکستان کے بعد
دو قومی نظریہ سے ہمارا مذاق

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ (۶۴/۲)

(اللہ نے تمہیں پیدا کیا پھر نظریۂ زندگی کے اختلاف کی بنیاد پر تم میں سے کچھ کافر ہو گئے اور کچھ مومن)

صدر گرامی قدر و عزیزانِ ملّت!! السلام علیکم

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے

ان دنوں مملکت پاکستان اور ملّتِ پاکستان، دونوں اپنی تاریخ کے جس شدید بحران سے دوچار ہیں وہ کسی بیرونی سازش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ اس کا اصلی سبب ہمارا بیمار معاشرہ ہے ہمارے معاشرہ کی آج حالت یہی ہو چکی ہے کہ:

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

جس طرح چیچک کے علاج کے لئے ایک ایک آبلہ پر پھاہا نہیں رکھا جا سکتا، اسی طرح ہمارے بیمار معاشرے کی لاتعداد بیماریوں کا الگ الگ علاج نہیں ہو سکتا، اس کے مرکزی بگاڑ کا علاج ہوگا تو حالت سُدھرے گی۔ سوال یہ ہے کہ یہ مرکزی بگاڑ کیا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کی صحیح تشخیص ہو جائے تو پھر مرض کا علاج چنداں مشکل نہیں ہوگا۔

مرکزی بگاڑ کے متعلق بھی میں تمہیداً یہی کہوں گا کہ ؎

تفصیلِ معنیٔ غمِ الفت طویل ہے
اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

اس بگاڑ کے مرکزی نقطہ کے متعلق مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت ہماری قوم اپنے ظاہر و باطن میں بے حد تضاد کی زندگی بسر کر رہی ہے اس سے اس کے تشخص (PERSONALITY)

میں تشتّت و انتشار (DISINTEGRATION) واقع ہوگیا ہے۔ اس تشتّت و انتشار کو منافقت یا (DUAL PERSONALITY) کہتے ہیں۔ اس منافقت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے ان اساسی و بنیادی نظریاتِ زندگی پر یقین نہیں رہا ہے جن کی بنیادوں پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔

جب قوم کے افراد کے دل میں اپنے بنیادی نظریات و تصوّرات کے متعلق بے یقینی کی کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر وہ معاشرہ بے یقینی کے جذام میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جیسے آج کل ہم ہیں۔ ہمارا اصلی مرض ہے ہی یہ کہ ہمیں اپنے بنیادی نظریات پر محکم یقین نہیں ہے جن کی بنیاد پر یہ ملک وجود میں آیا تھا۔ اس یقین کے بغیر نہ ہم ایک قوم بن سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری کوشش کوئی نتیجہ مرتّب کر سکتی ہیں۔ یاد رہے کہ قوموں کے شجرِ حیات کی اصل (جڑ) ان کا یقین ہے۔ ایسا یقین جس میں کسی قسم کا شک و شُبہ اور تذبذب و تزلزل نہ ہو اس لئے کہ:

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے

کہنے کو تو ہم کہتے ہیں کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے جس کی اساس و بنیاد "دو قومی نظریہ" ــــ اور "نظریۂ پاکستان" پر ہے لیکن عملاً یہ کہہ کر "دو قومی نظریہ" کی تردید کرتے ہیں کہ مسلمان اور غیر مسلم، دونوں جب ہماری نیشنل و صوبائی اسمبلی میں پہنچ جاتے ہیں تو وہاں ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ بظاہر ایسا نظر آئے گا کہ دو قومی نظریہ ہماری ہنگامی سیاست سے متعلق ہے جس کا فیصلہ ہمیں اپنی سیاسی مصلحتوں کے مطابق کر لینا چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ آپ دیکھیں گے، اس مسئلہ کا تعلق ہماری ہنگامی سیاست سے نہیں۔ یہ قرآنِ حکیم کی پیش کردہ ابدی حقیقت ہے اور دین کا اصل الاصول (۲/۶۴) حضرت علامہ اقبالؒ نے اسے اسی حیثیت سے پیش کیا تھا اور اس کی بنیادوں پر اس نظریاتی مملکت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی عمارت کے استحکام کا انحصار اس کی بنیاد پر ہوتا ہے اسی طرح مملکتِ پاکستان کی سالمیت کا دارومدار اسی نظریہ پر ہے۔ لیکن حصولِ پاکستان کے بعد، جو کچھ ہم نے اس قرآنی نظریہ کے ساتھ کیا وہ ایک بڑی المناک، جگر سوز اور دل دوز داستان ہے۔

رکھیو اے قوم! مجھے تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یہ داستان ہمارے قول اور فعل میں تضاد کی داستان ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کے "مرکزی بگاڑ" کی داستان ہے۔ یہ قرآنی نظریہ سے مذاق کی داستان ہے۔ میرا موضوعِ گفتگو بھی یہی ہے ــــ "حصولِ پاکستان کے بعد دو قومی نظریہ سے ہمارا مذاق"

بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

یہ مملکتِ پاکستان اور ملّتِ پاکستان کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ یہاں اس قسم کے عناصر شروع سے چلے آرہے ہیں ـــــ اور پنپ رہے ہیں ـــــ جو اس مملکت کی بنیاد کو کھوکھلا کرنے میں مصروفِ عمل رہتے ہیں ـــــ نظریۂ پاکستان جو دراصل قرآنی نظریۂ حیات کا دوسرا نام ہے، کو تو یہ کہہ کر ختم کیا جارہا ہے کہ یہ ہندو کی تنگ نظری تھی جس سے مجبور ہوکر ہندوستان کا مسلمان ان سے الگ ہوا۔ اور دو قومی نظریہ جو اسلام کی ایک ابدی صداقت ہے، کو عملاً ختم ہی کر دیا گیا ہے۔ اب اس کی اہمیت اتنی ہی رہ گئی ہے کہ اس قسم کے الفاظ سنائے جائیں کہ اس نظریہ کا خالق کون تھا۔ یہ سوال اٹھانے والے دین کی اصل وحقیقت سے ناواقف ہیں حالانکہ اس نظریہ کا خالق کوئی انسان نہیں بلکہ خود خالقِ کائنات ہے

آیئے دیکھیں! اللہ سبحانہٗ وتعالےٰ کے فرمان کے مطابق دو قومی نظریہ کیا ہے۔ رسولؐ اللہ نے اس نظریہ پر کیسے عمل کیا اور ہمارا عمل کیا رہا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد۔

دو قومی نظریہ ـــــ اللہ کا فرمان

سورۂ تغابن میں ارشادِ خداوندی ہے:۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ (۶۴/۲)

"اللہ نے تمہیں پیدا کیا، پھر نظریۂ زندگی کے اختلاف کی بنیاد پر تم میں سے کچھ کافر ہوگئے اور کچھ مومن"

یعنی پیدائش کے اعتبار سے، صرف انسان پیدا ہوتے ہیں۔ پھر وہ نظریۂ زندگی کے معیار کیمطابق دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ مومنین کا ـــــ دوسرا ـــــ غیر مسلموں کا۔

قرآنِ حکیم ان دو گروہوں کے علاوہ کسی اور گروہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ یعنی نوعِ انسان کی اس دو گروہوں میں تقسیم کو ہی دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے ـــــ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ "دو قومی نظریہ" نہ تو ہندوستانی باشندوں کی نسبت سے وجود میں آیا تھا اور نہ ہی تحریک یا مطالبۂ پاکستان کا پیدا کردہ تصوّر تھا۔ یہ اسلام کی ایک ابدی صداقت ہے جو اس دن ظہور میں آئی تھی جب اللہ نے پہلے پہل انسانوں کو وحی عطا کی۔ اور یہ ابد تک قائم رہے گی۔ جب تک دنیا میں ایک شخص بھی مسلم رہے گا۔ دو قومی نظریہ زندہ رہے گا۔ اس نظریہ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی یکسانیت (دین) ہے۔

اس نظریہ کی دو شقیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک ہی مُلک میں بسنے والے، ایک ہی زبان بولنے والے۔ ایک ہی

نسل سے تعلق رکھنے والے افراد اگر اس نظریہ کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے تو وہ اس قوم کے افراد نہیں بن سکتے جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتی ہے۔ بالفاظِ دیگر مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے خواہ وہ ایک ہی وطن کے باشندے اور ایک ہی نسل کے افراد کیوں نہ ہوں۔ اور دوسری شق یہ ہے کہ ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر جو قوم (امت) متشکل ہوگی اُس میں زبان، رنگ، نسل، وطن کی کوئی تخصیص باقی نہیں رہے گی۔ یہ سب ایک قوم کے افراد اور ایک تسبیح کے دانے ہونگے۔ نسل، وطن، زبان، ثقافت وغیرہ کے اختلاف سے یہ مختلف قومیتوں یا گروہوں میں نہیں بٹ سکتے۔

یہ ہے چند لفظوں میں دو قومی نظریہ کا مفہوم۔ اب آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ رسول اللہ نے دو قومی نظریہ پر کس طرح عمل کیا۔

دو قومی نظریہ ـــــ رسول اللہ کا عمل

رسول اللہ نے دو قومی نظریہ پر اس طرح عمل کر کے دکھایا کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں کسی قسم کا شک و شبہ رہا نہ کوئی ابہام۔ شق اوّل کا عملی مظاہرہ اس طرح ہوا کہ رنگ، نسل، وطن کا اشتراک تو ایک طرف حضورؐ کا حقیقی چچا ابولہب جس نے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا تھا اس قوم کا فرد تسلیم نہیں کیا گیا جو ایمان کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آئی تھی اور حضورؐ کے دوسرے چچا عباسؓ اور داماد ابوالعاص بھی اس وقت تک اس جدید قوم میں شمار نہیں کیے گئے جب تک وہ ایمان نہیں لے آئے۔

جہاں تک دوسری شق کا تعلق ہے، حبش کا بلالؓ، روم کا صہیبؓ، فارس کا سلمان اور عرب کا ابوبکر (رضی اللہ عنہم اجمعین) وطن، زبان، رنگ، نسل کے اختلاف کے باوجود ایک امت کے افراد قرار پا گئے اور ان میں ایسی وحدت اور یگانگت پیدا ہوگئی کہ اس کے بعد وطن، رنگ، نسل کی سابقہ نسبتوں کا تصور تک بھی ان کے ذہن میں نہ آیا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ اللہ کی توحید پر ایمان کا عملی مفہوم امت کی وحدت ہے اور وحدت میں کسی قسم کی تفریق شرک ہے

آپ نے "دو قومی نظریہ" کے بارے میں اللہ کا فرمان سنا۔ حضور رسالتمآبؐ کی سنّت ملاحظہ کی۔ اب ہمارا عمل ملاحظہ کریں۔ اور پھر فیصلہ کیجئے کہ ہم نے اس ابدی صداقت کے ساتھ سیاست کھیلی یا مذاق کیا یا دونوں کئے!

دو قومی نظریہ سے ہمارا مذاق

اوائل بیسویں صدی میں ہم کہا کرتے تھے کہ:

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

یہاں تک کہ، تہذیبِ حاضر نے جو بُت تراشے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے　　　(بانگِ درا۔ وطنیت)

لہٰذا، ـــــــ اے مصطفوی! خاک میں اس بُت کو ملا دے

اس تصور کا نتیجہ تھا کہ ہم نے اسلام کے عالمگیر برادری کے راستے میں وطن کی چار دیواری کو کبھی حائل نہ ہونے دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد اس دعویٰ پر رکھی گئی کہ اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی یکسانیت (دین) ہے، تو برّصغیر کے مسلمانوں کے لئے یہ آواز کوئی نئی آواز نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ قرآنِ حکیم کے دو قومی نظریہ کا تقاضا ہے۔

تحریکِ پاکستان کے دوران ہم قرآن کے اس پیغام عظیم کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچاتے رہے۔ کہ اسلام میں قومیت کی تشکیل دین کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے۔ یعنی اسلام کی رُو سے ہندوستان اور مراکش میں رہنے والے مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں اور ایک شہر میں رہنے والے مسلم اور غیر مسلم دو مختلف قوموں کے افراد ہیں۔

دس برس کی اس پیہم پکار کے بعد ہمیں پاکستان مل گیا، لیکن پاکستان ملنے کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے ایسی آوازیں اٹھنی شروع ہوگئیں جو اس امر کی غمازی کرتی تھیں کہ معیارِ قومیت کے متعلق جو کچھ ہم مسلسل کہتے چلے آرہے تھے اس پر ہمیں یقین نہ تھا وہ ہمارے دل کی آواز نہیں تھی۔ لیکن ہم اس کا کھلے بندوں اعتراف بھی نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے قول اور عمل میں تضاد واقع ہونا شروع ہوگیا۔ ہم پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو مسلم قومیت کے دائرے سے باہر بھی قرار دے رہے تھے اور اس کے ساتھ انہیں پاکستانی قومیت کے پورے حقوق بھی دئیے جا رہے تھے۔ یہ اسی دو دلی کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف ہم یہ کہتے ہیں کہ انتخابات جداگانہ ہوں گے اور دوسری طرف ہم مجالس قانون ساز میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتے۔ بالفاظِ دیگر ابھی ابھی ہم یہ، ہندوستان میں کہہ رہے تھے کہ مملکتِ ہند میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد قرار نہیں پا سکتے لیکن جونہی ہم نے واگہ کی سرحد پار کی۔ ہم نے اقرار و اعلان کر دیا کہ پاکستان کی حدود میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد ہیں۔ ہم نے اس سے <u>دو قومی نظریہ کا مذاق اڑایا</u>، اسلام کا مذاق اڑایا، اپنا مذاق اڑایا اور اب فطرت کے اٹل قوانین ہمارا <u>مذاق</u> اُڑا رہے ہیں۔ کاش ہم سوچیں سمجھیں۔

عزیزانِ من! اس مادہ پرستی اور مفاد پرستی کے دور میں جب کہ کوئی قدر بھی اپنے مقام پر باقی نہیں رہی۔ ابدی اقدار سے وابستگی اور غیر متبدل اصولِ حیات شیفتگی، عام نگاہوں کو تعجب انگیز دکھائی دیتی ہے کوئی اسے رجعت پسندی قرار دے گا اور کوئی دیوانے کا خواب۔ آپ مجھے چاہیں کچھ بھی کہیں میں کہے بغیر نہیں رہونگا کہ پاکستان کے حوالے سے دوقومی نظریہ کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان میں صرف ایک قوم بستی ہے جو خالصتاً مسلمانوں پر مشتمل ہے اور غیر مسلم نہ پاکستان قوم کے افراد ہیں نہ کسی ایسے معاملہ میں دخل دے سکتے ہیں جنہیں قومی (نیشنل) کہا جائیے۔ بات بالکل واضح ہے کہ جو شخص (غیر مسلم) مسلم ضابطۂ قوانین کے اصل واساس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا، وہ اس کے قوانین یا قومی معاملات کی ترتیب میں شریک کیسے ہوسکتا ہے۔ لیکن یہاں ہو یہ رہا ہے کہ جب مسلم اور غیر مسلم الگ الگ دروازوں سے، قومی یا صوبائی اسمبلی کے حال میں پہنچ جاتے ہیں تو وہاں پہنچ کر دونوں ایک قوم کے افراد قرار پا جاتے ہیں۔ وہاں غیر مسلموں کو بعینہٖ مسلمانوں جیسے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ وہاں جتنے مسائل پیش ہوں گے ان میں غیر مسلم برابر کا حصہ لیں گے۔ حتیٰ کہ اسلامی آئین اور اسلامی قوانین وضع کرنے میں بھی غیر مسلموں کو رائے دہندگی کا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔ اور ہوسکتا ہے کہ بعض معاملات کا آخری فیصلہ انہی کی آراء کے وزن سے ہو۔ یہ ہے غیر مسلموں کی پوزیشن ہماری اسمبلیوں میں۔ لیکن اس کے باوجود کہا یہ جاتا ہے کہ ہم دوقومی نظریہ پر قائم ہیں کیونکہ غیر مسلم جداگانہ دروازے سے اسمبلی میں داخل ہوئے ہیں۔

اب آپ ہی کہیں کہ یہ دوقومی نظریہ سے سیاست کھیلی جارہی ہے یا اس کا مذاق اڑایا جارہا ہے؟ ہم نے وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے کر پاکستان کی وجۂ جواز کی خود ہی نفی کردی ہے! یہ سب کچھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے لیکن ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

اب ہم اس نظریہ کی دوسری شق کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ جب کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کے مسلمان ایک قوم نہیں بلکہ چار قوموں میں منقسم ہیں۔ یعنی یہاں کے مسلمان اور غیر مسلم تو ایک قوم کے افراد ہیں، لیکن خود مسلمان ایک قوم کے افراد نہیں، ان کی چار الگ الگ قومیتیں ہیں۔ یاللعجب! یہ سراسر غیر اسلامی تصور ہے بلکہ یہ دونوں تصورات غیر اسلامی ہیں اور اسلام کے یکسر خلاف۔ یعنی یہ تصور کہ پاکستان (یا دنیا کے کسی اور حصہ کے) مسلمان اور غیر مسلم، وطن کے اشتراک کی بناء پر، ایک قوم کے افراد ہیں اور خود مسلمانوں کے اندر مختلف قوموں کا وجود ممکن ہے۔ آپ اپنی سیاسی مصلحتوں کی بناء پر جو جی میں آئے سمجھئے اور کیجئے۔ لیکن یہ دونوں نظریات اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف ہیں اور اگر آپ اس مملکت کو اسلامی بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو ان دونوں نظریات کو مردود قرار دینا پڑے گا! ——— اب آگے بڑھیئے!

نظریۂ پاکستان پہ کیا گزری

پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ ہم یہاں ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جو قرآنی خطوط پر متشکل ہو۔ یعنی ایک ایسی مملکت کا حصول جس میں اللہ کا دین ۔ اسلام، ایک عملی نظامِ حیات کی شکل میں کارفرما ہو۔ اسی کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں۔ جو درحقیقت قرآنی نظریۂ حیات کا دوسرا نام ہے۔ یہی وہ نظریہ تھا جس کی بنا پر ہم متحدہ ہندوستان کے تصور کو یہ کہہ کر رد کیا کرتے تھے کہ اس قسم کی مخلوط حکومت میں ہم اپنے دینی تصور کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ لیکن جب پاکستان مل گیا تو ہم نے اپنے اس دعوے سے گریز کی راہیں نکالنا شروع کر دیں۔ حد تو یہ ہے کہ کسی نے آج تک متعین طور پر نہیں بتایا کہ یہ نظریہ ہے کیا۔ اس کا تعین کچھ مشکل تو نہ تھا۔ اس سے دانستہ اغماض برتا گیا۔ کیونکہ جب نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعین ہو جائے گا تو قوم کو اس کی حدود کے اندر رہنا پڑے گا۔ یہی چیز قوم کے مفاد پرست گروہوں پر سخت گراں گزرتی ہے۔ قوم کے اربابِ سیاست پر بھی اور عمائدِ مذہب پر بھی۔ یہ ہے وہ حقیقی علت جس کی وجہ سے نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعین نہیں کیا جاتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہیے!

نظریہ پاکستان، قرآن کے دو لفظوں میں یہ ہے:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (۵/۴۸)

"اے رسولؐ! حکومت کتاب اللہ کے مطابق قائم کرو"

اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۸)

"جو لوگ کتاب اللہ کی حاکمیت قائم نہیں کرتے۔ وہی تو ہیں جو کافر ہیں"

حضور نبی اکرمؐ نے مدینہ میں جو اسلامی حکومت قائم کی اس کا آئین (CONSTITUTION) قرآن ہی تھا۔ ہم نے بھی ایسی ہی اسلامی حکومت قائم کرنے کیلئے ایک علیحدہ خطۂ ارضی کا مطالبہ کیا تھا کیونکہ الدین کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرنے کی صورت یہی تھی کہ قرآنِ حکیم کو عملی زندگی کا ضابطہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہی وہ کوشش تھی جو ہمارے زمانے میں تحریکِ پاکستان کی شکل میں سامنے آئی۔

پاکستان تو مذہبی پیشوائیت کی شدید مخالفت کے باوجود بن گیا لیکن ہم پاکستان کے بننے کے بعد اس کے

بنانے کا مقصد ہی بھول گئے اور بھولے چلے آرہے ہیں۔ اب ہم نے یہاں کتاب اللہ کی حکمرانی کی بجائے مذ
فرقوں کی حکمرانی قائم کر رکھی ہے۔ ہر مذہبی فرقے کو ہمارے موجودہ آئین نے اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اپ
فرقے کے نظریہ کے مطابق شخصی قوانین کی حد تک "قرآن و سنت" کی اصطلاح کی تشریح کر سکتا ہے (آئین
آرٹیکل نمبر ۲۲۷)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب ہر مذہبی فرقے کا اپنا اپنا "اسلام" ہے۔ اس کے باوجود ہما
دعویٰ اب بھی یہی ہے کہ ہم اللہ کی کتاب کے ایک ایک لفظ پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ منافقت ہمیں لے ڈوبی
ہے۔ امت کی وحدت کی بنیاد ایک اللہ کے ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے پر ہوتی ہے۔ امت میں
تفرقہ کے معنی یہ ہیں کہ مختلف فرقے اپنی زندگی مختلف ضوابط کے ماتحت بسر کرتے ہیں اور یہ قرآن کی نظر میں
شرک ہے (۳۰/۳۱-۳۲)۔ لیکن اب قرآن کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ اس سے تعویذوں، ٹوٹکوں، وظیفوں
اور استخاروں کا کام لیا جائے۔ اس پر غور و فکر کی قطعاً ضرورت نہیں بلکہ بلا سوچے سمجھے اس کی اندھا دھند
تلاوت کر کے اسے ریشمی غلافوں میں سجا کر گھروں میں لٹکائے رکھو ——— اور ہم یہی کر رہے ہیں۔ مذہبی
پیشوائیت ہمیں برابر اس خود فریبی میں مبتلا رکھے چلی آرہی ہے کہ اس دنیا کی ذلت جنت اخری کی ضمانت
ہے اور ہم ذرا نہیں سوچتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے غور و فکر کرنا ہم نے اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا ہو۔
یہاں پچھلے بیالیس سالوں سے مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہونا چاہیئے۔
لیکن یہ مطالبہ کرنے والے (ہمارے علماء و مشائخ) میں سے آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ وطنیت کی بنا پر
تشکیل قومیت اسلام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتی ہے، یہ اس لئے کہ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت بالعموم
ان علماء (یا اُن کے شاگردوں) پر مشتمل ہے جنھوں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ یہ وہ حضرات ہیں جن
کے بارے میں علامہ اقبالؒ کو کہنا پڑا تھا کہ:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ لوگ وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے کر نہ صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے
دوران ان کا (یا ان کے اساتذہ کا) موقف صحیح تھا بلکہ حصولِ پاکستان سے انہیں جو شکستِ پندار ہوئی تھی
اس کا انتقام بھی لینا چاہتے ہیں۔ اس لئے یہ اللہ کے دین ——— اسلام ——— کو یہاں نافذ نہیں ہونے دیتے۔
اور ہمارے اربابِ سیاست و حل و عقد ان کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے
اربابِ حل و عقد میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہو کہ مسلمانوں میں قومیت کا مدار اشتراکِ
دین ہے، اشتراکِ وطن نہیں۔ لیکن اس کی جرأت بھی شاید ہی کسی کو نصیب ہو کہ وہ اپنے عقیدے کا کھلے بندوں

سامان کر دے۔

اس داخلی کشاکش کا سب سے زیادہ مضرت رساں نتیجہ یہ ہے کہ ہم پاکستانی نہ تو قرآن کے بلند آئیڈیل کے مطابق ایک عالمگیر مسلم قوم بن سکے اور نہ ہی وطنیت کے عام تصور کے مطابق، پاکستان کی حدود کے اندر ہی ایک قوم کے پیکر میں ڈھل سکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہم میں قومیت کی اجتماعی زندگی کا شعور ہی موجود نہیں۔ ہم سب انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے ہمارے سامنے انفرادی مفاد سے بلند کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ مفاد پرستی منافقت کو جنم دیتی ہے اور یہ ہے ہمارا اصلی مرض اور

ہمارے مرض کا علاج

اس مرض کا صحیح علاج ہے اپنے نظریاتِ حیات پر محکم یقین اور اپنے تصوراتِ زندگی پر غیر متزلزل ایمان اور ان پر صدقِ دل سے عمل۔ جب قوم کے افراد کے دل میں اپنے نظریات و تصورات کے متعلق اس قسم کا کوہ آسا یقین پیدا ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ ان کا یہی ساز و سامان کس قسم کے کہکشاں گیر نتائج پیدا کرتا ہے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا (بانگِ درا)

اس قسم کے یقین کے بغیر نہ ہم ایک قوم بن سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری کوششیں کوئی نتیجہ مرتب کر سکتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ قوموں کے شجرِ حیات کی اصل (جڑ) ان کا یقین ہے۔ یعنی اپنے نظریات پہ یقین اور ان پر عمل۔

سوال اٹھتا ہے کہ موجودہ حالات میں، افرادِ قوم کے دل میں اس قسم کا یقین پیدا کیسے کیا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یقین پیدا ہوتا ہے صحیح تعلیم سے، اور ہمارے ہاں ؎

یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

کہنے والے نے غلط نہیں کہا تھا کہ ؎

دِل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے

خود قرآن نے بھی رسول اللہ کا بنیادی فریضہ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ بتایا تھا۔ لہٰذا اگر ہم نے مسلمان قوم کی حیثیت سے جینا ہے تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم قرآن کی تعلیم کو عام کر دیں۔ لیکن قرآن کی تعلیم سے مُراد وہ تعلیم نہیں جو ہمارے مذہبی مدارس میں "دینی علوم" کی شکل میں دی جاتی ہے اور جو طلباء کو قرآن سے بیگانہ ہی نہیں بنا دیتی، بلکہ اس پر ان کا ایمان بھی ختم کر دیتی ہے۔ قرآن کی تعلیم ایسی ہونی

چاہیئے کہ متعلم علیٰ وجہ البصیرت یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ بلاشک وشبہ یہ کتاب عظیم نوعِ انسانی کیلئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اور انسانیت کی مشکلات کا صحیح حل اس کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔

تعلیم کی بات چلی ہے تو اس سے ایک اہم نکتہ سامنے آگیا۔ وطن یا نسل کو بنائے قومیت قرار دینے سے، قوم کی تشکیل کے لئے کسی قسم کی جدّوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر بچہ پیدائشی طور پر اس قوم کا فرد ہوتا ہے لیکن کسی نظریہ کی بناء پر قوم کی تشکیل کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کے بچّوں کو اس نظریہ کی تعلیم دی جائے۔ ہم نے تعلیم کے اس اہم مقصد سے اغماض برتا اور آج اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔

ہمارے موجودہ ناقص نظامِ تعلیم پر نظرِ ثانی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ نظرِ ثانی ایسے افراد کے ہاتھوں ہونی چاہیئے جو "دو قومی نظریہ" اور "نظریۂ پاکستان" پر یقین رکھتے ہوں۔ موجودہ حالات میں یہ یقین انتہائی ضروری ہے اور ہمیں چاہیئے کہ قراردادِ پاکستان کی گولڈن جوبلی کی عام تقریبات میں اور ہر سطح پر اس پر زور دینا چاہیئے۔

حرفِ آخر / خلاصۂ گفتگو

میری گفتگو کے چیدہ چیدہ نکات یہ ہیں!

1 ــــ جس ملّت کے افراد کی یہ حالت ہو کہ انہیں نہ کسی اصولِ زندگی پر یقین ہو نہ ضابطۂ حیات پر دِل سے ایمان۔ وہ زبان سے جس روش پر عقیدہ ظاہر کرتے ہوں، دل سے اس کی صداقت کے قائل نہ ہوں۔ وہ کہتے کچھ ہوں اور چاہتے کچھ اور۔ ان میں قومی شعور بیدار نہیں ہوتا۔ وہ انفرادی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں اور ان کے سامنے انفرادی مفاد سے بلند کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ یہی اب ہماری حالت ہے۔ نتیجہ اس کا وہ اطمینان سوز جہنّم ہے جس میں ہم من حیث القوم مُبتلا ہیں۔ یہ ہے ہمارا اصلی مرض اور اس مرض کا علاج اپنے نظریاتِ حیات پر محکم یقین اور اپنے تصوراتِ زندگی پر غیر متزلزل ایمان ہے!

2 ــــ یاد رہے کہ مملکتِ پاکستان کی اساس و بنیاد ــــ دو قومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان پر تھی! لہٰذا

3 ــــ جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہ رکھی جائے کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم قرار نہیں دیئے جا سکتے نہ یہ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے، نہ ہمارا آئین اسلامی۔ دو قومی نظریہ کا عملی مفہوم یہی ہے (غیر مسلموں کے حقوق و مراعات وغیرہ کا مسئلہ، یہ اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہوتی ہے جو ایک علیحدہ بحث ہے۔

4 ــــ جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہیں رکھی جاتی کہ مسلمانوں میں متعدد قومیتوں کا نظریہ اسلام ک

ضد اور مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہے، نہ ملّتِ واحدہ وجود میں آسکتی ہے نہ پاکستان محفوظ رہ سکتا ہے۔

۵ ـــــ جب تک دو قومی نظریہ کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں ہمارے نصابِ تعلیم میں داخل نہیں کیا جاتا ـــــ پاکستان کا مستقبل مستحکم نہیں رہ سکتا۔

۶ ـــــ علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ دو قومی نظریہ کی حقیقت کو وہی سمجھ سکے گا جو اسلام کے اصولوں پر غائر نگاہ رکھتا ہو۔ محض سیاسی عینک سے اس نظریہ کو اس کی اصلی شکل میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ اللہ کرے ہمیں ایسا "میرِ کارواں" مل جائے جو قرآنی ذہن رکھتا ہو تاکہ کاروانِ ملّت صحیح راستے پر گامزن ہو سکے۔

۷ ـــــ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اگر ہم نے دو قومی نظریہ کی بناء پر پاکستان حاصل نہ کیا تو برصغیر میں نہ مسلمان باقی رہیں گے، نہ اسلام۔

۸ ـــــ اور ہمارے وقت کے عظیم مفکرِ قرآن علامہ پرویزؒ نے فرمایا تھا:

"آپ مجھے اپنی زندگی کے اس ڈھلتے ہوئے دور میں اس جگر شگاف اور جاں سوز حقیقت کو زبان تک لانے کی اجازت دیجئے کہ اگر ہم نے نظریۂ پاکستان اور اس کے عملی تضمنات کو نظر انداز کر دیا جو درحقیقت قرآن ہی کے نظریۂ حیات کا دوسرا نام ہے تو اوّل تو یہ مملکت ہی باقی نہیں رہ سکے گی کیونکہ اس کی وجۂ جواز ہی ختم ہو جائے گی اور اگر یہ باقی بھی رہے تو یہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ نہیں بن سکے گی جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑے گا کہ وہ اپنے ظہور (غلبہ) کے لئے کوئی اور خطۂ زمین تلاش کر لے گا۔ لیکن ہمارا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔"

آج علامہ پرویزؒ کی برسی بھی ہے:

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے!

ہم اس مفکرِ قرآن کی خواہش کے احترام میں اتنا تو کر سکتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان کو اپنی تقریروں اور تحریروں کا مرکزی موضوع بنائیں۔ اور لوگوں کو بتائیں کہ ہم نے یہ خطۂ ارضی مذہبی فرقوں کے پنپنے کے لئے حاصل نہیں کیا تھا بلکہ اللہ کی حکومت کتاب اللہ کے ذریعے، قائم کرنے کے لئے حاصل کیا تھا۔ اب جب کہ، حکومت، قراردادِ پاکستان کی گولڈن جوبلی منا رہی ہے ہمیں ہر ممکن طریقہ سے پاکستان کا یہ اساسی و بنیادی نظریہ، حکومت اور لوگوں کے سامنے رکھنا چاہیئے اور انہیں بتانا چاہیئے کہ ہمارا نصب العین کیا تھا اور ہم

چل کن راہوں پہ رہے ہیں۔ جس بات کا علامہ پروفیسر رونا رو رہے ہیں، وہ یہی ہے کہ نظریۂ پاکستان کو ہر حکومت، ہر پارٹی، ہر فرقہ، ہر گروہ نے پسِ پشت ڈالنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے مُلکِ عزیز پاکستان اندرونی اور بیرونی خطرات کے گرداب میں گھر گیا ہے۔ اب پاکستان کے تحفظ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ نظریۂ پاکستان کو پہلے واضح الفاظ میں متعین کیا جائے اور پھر اسے قوم کا نصب العین قرار دیا جائے۔ اس نظریہ سے بدستور منافقت ہمیں بہت مہنگی پڑے گی۔ سانحۂ مشرقی پاکستان ابھی کل کی بات ہے! حکومت کو واضح الفاظ میں بتانا ہوگا:

جنہیں حقیر سمجھ کے بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی!

اور ملّتِ پاکستان کو جھنجھوڑنا ہوگا، ان میں تحریکِ پاکستان کا جذبہ ایک بار یہ کہہ کر ابھارنا ہوگا:

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے!
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے!

انھیں اللہ کا یہ اٹل قانون یاد دلانا ہوگا:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا (۱۳/۱۱)

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ

اور جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس کو عملی شکل دینے کیلئے جدّوجہد کی پہل بھی ہمیں ہی کرنی ہوگی۔ اپنے یقین اور اس میثاق کو اس کے منطقی نتیجہ پر پہنچانا ہوگا۔ اپنے اندر ذہنی اور فکری تبدیلی لانے کے لئے جدوجہد کرنی ہوگی۔ انکی موجودہ ذہنیت بدلنی ہوگی۔ دین کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہبی پیشوائیت کو ہٹانا ہوگا اور اسے ہٹانے کا واحد اور آسان طریقہ ہے:۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲)

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

آخر میں میرے ساتھ دعا میں شامل ہوئیے!

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۶۶/۸)

"اے ہمارے رب! ہمارے نورِ بصیرت کو مکمل کر دے اور زندگی کے ہر قسم کے خطرات سے ہمیں محفوظ رکھ بے شک یہاں ہر بات تیرے مقرر کردہ قوانین کے مطابق واقع ہوتی ہے!!

خطاب جناب ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب

تحریکِ پاکستان

جس موقع کی یاد تازہ کرنے کے لئے آپ یہ سیمینار منعقد کر رہے ہیں ایسے موقعے قوموں کی زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ موقع اپنی جگہ اہم سہی مگر اصل بات وہی ہے جو قائداعظمؒ نے فرمائی تھی کہ پاکستان تو اسی روز معرضِ وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ قائداعظم کی یہ بات بڑی جامع، بڑی دُور رس اور بڑی ہی بنیادی بات ہے اسے محض ایک سیاسی رہنما کا بیان کہہ کر آگے بڑھ جانا مناسب نہیں۔

مخالفین کے امام، گاندھی جی جنہیں ان کے پیرو اور مداح مہاتما گاندھی کہتے تھے جن کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ پاکستان ریزولیوشن پاس ہونے کے بعد اپریل ۱۹۴۰ء کے کانگرس کے رام گڑھ کے اجلاس میں اس وقت کے صدر، مولانا ابوالکلام آزاد (جو کبھی امام الہند بھی کہلاتے تھے۔) نے فرمایا :- آج ہماری کامیابی کا دار و مدار تین چیزوں پر ہے۔" ۱۔ اتحاد ۲۔ ڈسپلن ۳۔ مہاتما گاندھی کی راہنمائی پر اعتماد یہی ایک تنہا راہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا اور اسی سے ہم ایک فتحمند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔ یہی گاندھی جی قائداعظمؒ کے نام اپنے ایک خط میں یوں مخاطب ہیں :

"میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو وہ اور ان کی اولاد یہ دعوےٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں، اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک ہی قوم رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔"

مہاتما جی کا یہ تجاہلِ عارفانہ تھا، میں نہیں مانتا کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ تاریخ اس کی مثال پیش کر چکی ہے جب حبش کا بلالؓ، فارس کا سلمان اور روم کا صہیب تو محمدؐ کی قوم کے افراد تھے اور عرب ہی کے رہنے والے قریش ہی کے لوگ، خود بنو ہاشم کے افراد مخالف قوم کے افراد تھے۔ اگرچہ وہ اسی قبیلے، نسل رنگ، عادات

کے حامل افراد تھے، وہی زبان بولتے تھے"۔۔۔۔۔

اور یہ مخالفت صرف ذہنی نہیں تھی۔ ایسا موقع بھی آیا کہ باپ ابوبکر ایک طرف سے شمشیر بکف تھے تو بیٹے عبدالرحمٰن دوسری طرف سے آمادۂ قتال تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اسی اجلاس میں جہاں یہ قرارداد پاس ہوئی تھی۔ قائداعظمؒ مخالفین کے ذہنوں کی یہ گرہ کھول چکے تھے۔ انہوں نے فرمایا تھا:

"میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی اسلام اور ہندو مت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریزاں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بناء پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے ہندو اور مسلمان زندگی کے ہر معاملے میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے الگ ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔"

قرارداد کو پاس ہوئے نصف صدی اور اس کی بناء پر قائم مُلک کو معرضِ وجود میں آئے بیالیس سال ہو چکے مگر آج بھی اچھے خاصے پڑھے لکھے دانا بینا قسم کے لوگ سوال کرتے ہیں کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا، اس کے مقاصد کیا تھے اور جو جوابات سننے میں آتے ہیں وہ اور بھی حیرت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔۔۔ مخالف کیمپ کے لوگوں کی بات تو جانے دیں مگر دکھ اس وقت ہوتا ہے جب دولتانہ سے یہ بیان منسوب ہوتا ہے کہ پاکستان معاشی ضروریات کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا اور خود کو قائداعظمؒ کے بیٹوں سمان کہنے لے شوکت حیات کہے کہ قائداعظمؒ مذہب سے بے بہرہ تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامِ پاکستان سے پہلے مسلمان بہت پسماندہ تھے۔ تعلیم میں، ملازمتوں میں تجارت میں، صنعت میں ان کا کوئی مقام نہ تھا۔۔۔۔۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان نے ان پر ترقی کے یہ تمام دروازے کھول دیئے، جو ساری عمر کلرکی سے اوپر اٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، سیکرٹری کے عہدوں تک جا پہنچے، جو چھوٹی سی دوکان بھی اعتماد سے نہ سنبھال سکتے تھے اجارہ دار، ساہوکار اور سیٹھ بن گئے، کارخانوں سے مال لاد کر لے جانے پر ملازم لوگ کارخانہ دار ہو گئے، انتظامیہ کی طرف سے کھلی چھٹی اور غیر انسانی منافع خوری کی بدولت دولت میں کھیلنے لگے۔ چھوٹی چھوٹی تنگ و تاریک گلیوں میں معمولی مکانوں میں رہنے والے، نئے، گلہ نگ بستیوں میں سبزہ زار بنا کر معتبر بن بیٹھے۔ وہ جن کی زمینیں ہندوؤں کے ہاتھ رہن تھیں دوبارہ زمینوں کے مالک بن بیٹھے۔۔۔۔۔ ان گنہگار کانوں نے خود

ایسی ہی ایک مجلس میں پاکستان کے ایک سابق چیف جسٹس سے پاکستان بننے کے نتیجے ہیں جو کچھ سنا تو یہ کہ پہلے انار کلی میں مسلمان کی ایک آدھ دکان تھی۔ اب انار کلی ہی نہیں مال روڈ پر ہی مسلمانوں ہی کی دکانیں ہیں، ملیں ہیں، کارخانے ہیں، دفتروں میں سب افسر مسلمان ہیں۔

مجھے تسلیم ہے کہ ان ملازموں، ان دکانداروں، موقع پرستوں، زمینداروں کیلئے تو یہ جذبۂ محرکہ ہو سکتا ہے۔ مگر ان لاکھوں کروڑوں سیدھے سادے لوگوں کے لئے جذبۂ محرکہ نہیں ہو سکتا جو اپنا سب کچھ صدیوں پرانے مساکن۔ پرکھوں کی بسائی ہوئی بستیاں اور بزرگوں کی قبریں چھوڑ کر، اپنا سب کچھ پاکستان کے نام پہ نچھاور کرنے کے لئے اس قافلے میں شامل ہو گئے جو قائداعظمؒ کی قیادت میں اپنے تاریخی اور تاریخ ساز سفر پہ ہر مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے گرم سفر تھا، جنہوں نے اس کے لئے سب سے زیادہ قربانیاں دیں، وہ مسلمان بھی اس قافلے میں شامل تھے جنہیں معلوم تھا وہ پاکستان کا حصہ نہ بن سکیں گے، وہ کسی صورت بھی پاکستان کی مواقع اگلتی زمین سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ سندھ بلوچستان اور سرحد اور پنجاب کے مسلمانوں کو تو اس میں کوئی لالچ ہو سکتا تھا۔ اگر یہ صرف انہی کی مہم ہوتی تو ہم اسے حق خودارادیت کی مہم بھی کہہ لیتے مگر سارے کے سارے اسلامیانِ ہند پہ یہ جادو کس نے کر دیا تھا۔

آئیے غور کریں یہ مطالبہ کیا تھا، یہ مطالبہ کیوں تھا۔ لوگ کہتے ہیں یہ اقبالؒ کا خواب تھا، آئیے! اقبالؒ ہی سے پوچھتے ہیں کہ یہ خواب کیا تھا۔ ۱۹۳۰ء خطبہ الٰہ آباد کا یہ اقتباس سنیئے:

> "ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے، اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کی جائے۔"

کیا وہ اس کے مضمرات سے واقف نہ تھے۔ اقبالؒ سا دانائے راز صدیوں بعد کسی قوم کو انعام خداوندی کی صورت میں ملتا ہے۔ اقبالؒ ایسا کیوں چاہتے تھے۔

سنئے اقبالؒ اس سلسلے میں کیا فرماتے تھے:

> "تاریخ کے سفر میں اسلامی اخلاقیات، معاشرت، اسلامی آئیڈیلز، مقامی اثرات اور مسلم اقوام کے زمانہ قبل از اسلام کے توہمات کے زیر اثر آہستہ آہستہ DE. ISLAMIZE ہو چکے ہیں ہمیں اس زنگ کو اس پر سے کھرچ کر علیحدہ کرنا، اسے متحرک کرنا اور درخشاں قومی ہیئت دینی ہے۔ اس سے اسلام کو وہ موقع میسر آئے گا کہ عرب ملوکیت کی مہر اپنے آپ سے

ہٹا سکے اور اسے یہ موقعہ ملے کہ وہ اپنے کلچر، اپنی تہذیب، اپنے تمدن کو ایک طرف اپنی اصل روح سے ہم آہنگ کر سکے اور دوسری جانب زمانہ حال کی رُوح سے۔"

اس تصور کے پیچھے کیا سوچ تھی، کیا فلسفہ تھا۔ خطبات مدارس کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے، یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔"

فلسفے کی زبان ذرا مشکل زبان ہوتی ہے۔ عوام الناس تک آسان لفظوں میں پہنچائی ہوتی ہے۔ فلسفے کی زبان تھی کہ اسلام تخت و تاج سے وفاشعاری کا مطالبہ نہیں کرتا، وہ صرف خدا سے عہد استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور سیاسی راہنما سمجھا رہا تھا:

"اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے معنوں میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالا علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

سُنا دولتانہ صاحب، سنا شوکت حیات صاحب، فلسفے کی زبان علامہ اقبال کا خواب تھا اور سیاسی راہنما کے الفاظ اس کی تفسیر۔

پاکستان کی تشکیل میں ان دو راہنماؤں کی مسلمہ حیثیت کو تو کوئی دیوانہ ہی چیلنج کر سکتا ہے۔ ان دونوں راہنماؤں کے فرمانے کے بعد پاکستان کے مطالبے اور قائدِ اعظمؒ کی مذہب کی رُوح سے واقفیت میں کوئی شک رہ جاتا ہے۔ کیا اس کے بعد یہ بتانے کی ضرورت رہ جاتی ہے کہ ہم بے نام لوگوں نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ اور اس خطۂ زمین کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے لاکھوں جانوں کی قربانی کیوں دی اور تاریخ انسانیت کی سب سے بڑی ہجرت کیوں کی۔

مگر تاریخ کی اس ستم ظریفی کو کیا کہئے کہ اس کے مخالفوں میں ہندو کانگریس اور اس کے حاشیہ بردار انگریز کے ٹوڈی ہی نہیں۔ علمائے کرام کی بہت بڑی اکثریت بھی نظر آتی ہے۔ بڑے بڑے محترم بزرگوں کا نام نظر آتا ہے۔ بڑے بڑے مفتیانِ کرام اور لفظ قسم کے علماء

اگر اس مملکت کے قیام کا فلسفہ وہی تھا جو میں نے اس کے بانیانِ کرام کی زبانی بیان کیا ہے اور ان دونوں کی دانائی اور خلوصِ نیت پر کوئی کافر ہی شک کر سکتا ہے (بلکہ ان کی سچائی کے تو کافر بھی معترف ہیں)

ان بزرگوں کو تو اس تحریک کے دست و بازو بن کر ہراول دستے میں شامل ہونا چاہیئے تھا۔
یہی ایک نکتہ ہے سمجھنے کا اور سمجھانے کا۔
ایک وجہ تو اصفہانی صاحب نے اپنی کتاب (QUAID-E-AZAM AS I KNEW HIM) میں لکھی ہے اور دوسری وجہ ان حضرات کے ذہنوں میں اسلام کا وہ مفہوم تھا جس میں اسلام کی پابندی ایک ملے جلے معاشرے میں رہ کر بھی ہو سکتی ہے۔ نماز، روزے اور دوسری عبادات کی بلا روک ٹوک اجازت اور شخصی قوانین، نکاح، طلاق کے قانون ہر فرقے کے اپنے یعنی جہاں ان حضرات کی اپنی چودھراہٹ قائم رہتی تھی، مذہب کی آزادی کا یہی تصور تھا جس کے متعلق علامہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ "جنگ" میں شائع شدہ مضمون میں لکھتے ہیں:

"تحریکِ پاکستان دراصل شریعت کی تعبیرِ نو کا دوسرا نام ہے جو لوگ تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے وہ اپنے نقطۂ نظر سے شریعت کی تعبیر کرتے تھے اور علامہ اقبالؒ نے تعبیرِ شریعت کے اپنے اصول بیان کئے۔ تحریکِ پاکستان کی موافقت اور مخالفت دراصل ان دونوں تعبیروں کی موافقت اور مخالفت تھی۔ اقبالؒ اور قائدؒ کی تعبیر کے مطابق پاکستان کا قیام اسلام کا تقاضا تھا جب یہ دونوں تعبیریں فیصلے کے لئے برصغیر میں بسنے والی امتِ مسلمہ کے سامنے پیش ہوئیں تو امت نے اقبالؒ اور قائدؒ کی تعبیرِ شریعت کو قبول کیا۔"

قائدِ اعظمؒ نے شروع پاکستان ہی میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ یعنی وہ ایسی سیاست نہ ہوگی جہاں مذہبی پیشوائیت بزعمِ خود خدائی مشن پورا کرنے کے لیے عملاً حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ان حضرات کا یوں جوق در جوق پاکستان میں ہی نہیں، پاکستان کی سیاست میں [illegible] اور پاکستان کی سیاست میں ان کا کردار یہ واضح کرتا ہے کہ ان لوگوں کے عزائم کیا تھے اور ہیں ۔۔۔ [illegible] تھیاکریسی، یہ لوگ شروع دن سے پاکستان کے ہر سیاست دان اور ہر حکومت کو بدنام کرتے رہے۔ [illegible] موقع نہ گنوایا الزام تراشی کا، اور الزام یہی کہ اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے اس ملک میں یہ لوگ اسلامی [illegible] کیوں نہیں کرتے اور خود ہی یہ جواب کہ یہ لوگ اسلام کو سمجھتے ہی نہیں۔ اور جب ایوب خاں نے [illegible] دستاویز بنا کر لے آؤ میں آنکھیں بند کر کے دستخط کر دوں گا۔ ان لوگوں نے کہا یہ شخص،

بدنیت ہے۔ ہمارے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ آج تک ان کی یہی صورتِ حال ہے۔ گذشتہ مارشل لاء ایسا دور بھی ان کو نصیب ہوا کہ ان کی دربارِ شاہی میں بڑی رسائی رہی، بڑا اثر و رسوخ رہا۔ مگر اسلام کی طرف پیش رفت یہ کوئی نہ کر سکے۔ نظامِ صلوٰۃ کا ڈول ڈالا، کچھ نہ نکلا، زکوٰۃ کو سُود میں سے کاٹا۔ سُود کو منافع اور مارک اپ کا نام دیا، چند سزاؤں پہ شور و غوغا مچایا اور بس گویا ان کے نزدیک اسلام کچھ عبادات اور کچھ سزاؤں ہی کا نام ہے۔ اقبالؒ کا کہنا تھا:۔

ISLAM IS NOT A CHURCH. IT IS A STATE
CONCEIVED AS A CONTRACTUAL ORGANISM
LONG BEFORE ROUSSEOU EVER THOUGHT
OF SUCH A THING.

اور قائدؒ کا فرمانا تھا:۔ جب میں انگریزی لفظ ریلیجن سنتا ہوں تو اس زبان کے محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقیّد مفہوم اور تصور نہیں۔

خدا کی اس عظیم الشان کتاب (قرآن پاک) کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ مگر ان لوگوں کی نگاہ وہی کچھ عبادات اور کچھ تعزیرات تک محدود رہیں۔ کسی نے نہ بتایا کہ اسلامی معاشرہ کن اقدار پر تعمیر ہوتا ہے۔ اسلام کا معاشرتی اور معاشی نظام کیا ہے۔ اسلام افراد کی سیرت و کردار کی تعمیر کن خطوط پر چاہتا ہے!

زندہ رود میں ایک جگہ جاوید اقبالؒ مرتب مکتوبات شیخ الاسلام (مولانا مدنی) کا ایک قول لکھتے ہیں کہ پاکستان میں قوانین سازی کا اصول فکرِ اقبال کی روشنی میں تو ہو سکتا ہے کیونکہ پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے وہ اقبالؒ ہی کے فلسفہ کا دوسرا نام ہے ـــــ اور اسی کتاب میں ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

"آخر اقبالؒ کا تصورِ اسلام کیا ہے؟ مختصر آگہی کہ ایک نیا معاشرہ وجود میں لایا جائے، جو اجتہادی نکتۂ نگاہ سے قرآن و سنّت کی روشنی میں وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق اپنے تمام مسائل حل کرنے کی اہمیت رکھتا ہو۔ علماءِ پاک و ہند نے ہمیشہ اس قسم کی اجتہادی آزادی کو شک و شُبہ کی نگاہ سے دیکھا ہے۔"

معاشی نظام کے بارے میں اقبالؒ کے تصورات سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے، قائدِ اعظمؒ کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:۔

"اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کی کسی موزوں شکل کی ترویج سے جب اسے شریعت کی تائید اور موافقت حاصل ہو۔ حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔"

آپ کا دھیان ان فتووں کی طرف جائیگا جن کی گونج آج بھی فضا میں ہے۔ مگر اقبالؒ کا اعلان بھی سُن لیجئے!!

"میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی محض مادی تعبیر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا۔"

معاشی نظام کے بارے میں قائدِ اعظم کے ذہن میں بھی کوئی ابہام نہ تھا۔ ان کی زندگی کی آخری سرکاری تقریب سٹیٹ بنک کا افتتاح تھا۔ اس میں آپ نے جو کچھ فرمایا اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسوقت اس جسمانی طور پر کمزور و نحیف بیمار شخص کے ذہن میں کس قدر واضح اور روشن نقشہ تھا مستقبل کے معاشرے کا، کس قدر شدید احساس تھا ذمہ داری کا جو ہم نے پاکستان بنا کر اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ آپؒ نے فرمایا:

"ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو اسلامی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان کی حیثیت سے عاید ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ نظام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچا لے جائے اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔"

اِن الفاظ کو پھر سے دُہراتا ہوں، ــــ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا ــــ

وہ دونوں مروّجہ نظاموں کا خوب تجزیہ کر چکے تھے۔ مغرب کے جمہوری نظام نے جس طرح صنعتی طور پر ترقی یافتہ مہذب مغربی ملکوں کو نیشنلزم کے چکر میں لا کر ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا اور وہ بھی اس طرح کہ کون پسماندہ ممالک کو لوٹنے گھسوٹنے کی دوڑ میں سبقت لے جائے۔ لوٹ گھسوٹ کی اس دولت سے مالا مال مغربی استعمار نے دنیا میں جس نئی طرز کی غلامی کو رواج دیا اور انسانیت کو پہلے سے بھی سخت زنجیروں میں جکڑ دیا، جسمانی غلامی سے زیادہ تکلیف دہ معاشی اور معاشرتی غلامی۔ اس کا ردِّ عمل اقبالؒ نے اپنی آنکھوں روس سے اٹھنے والے اشتراکی انقلاب میں دیکھا جو نچلے طبقوں، پسے ہوئے کچلے ہوئے انسانوں کی آزادی اور حکمرانی، معاشی انصاف کے دعووں کے ساتھ کامیاب ہوا۔ مگر ہم نے دیکھا کہ جلد ہی یہ انقلاب چند جابر و ظالم حاکموں کا ہتھیار بن گیا۔ اس معاشرے میں جبر، ظلم سکہ رائج الوقت ہو گئے۔ عزتِ نفس، آزادی، اظہار اجنبی جنس ہو گئے۔ اقبالؒ کی نگاہِ دُور بیں نے اسی وقت اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا اور اس مساوات کو مساوات شکم کہہ کر رد کر دیا۔ اس لئے کہ یہ کیسی حاکمیت ہے:

ایں خدا نانِ دہد جانے بُرد

اس کے مقابلے میں قرآن جب انسانوں کو رزق کی تقسیم کا ذکر کرتا ہے تو اسے رزقِ کریم کہہ کر پکارتا ہے۔ جس میں رزق کے ساتھ ساتھ عزتِ نفس بھی ہے۔ اقبالؒ نے اس انقلاب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بنیاد نفی پر ہے۔ لاسلاطیں، لاکلیسا، لاالٰہ اور نفی پر بنیاد باطل اور بے ثبات بنیاد ہوتی ہے:

درمیانِ لا نہ آساید حیات
سوئے الا می خرامد کائنات

مغرب کے مفکروں نے جب اپنے نظام کا تجزیہ کیا تو اس کی کمزوریوں کو بھانپا۔ انہیں دُور کرنے کی کوشش کی۔ ویلفیئر سٹیٹ تک ان کی جدوجہد پہنچی مگر اس سے بھی ان کے مسائل حل نہیں ہوئے۔ خودکشیوں کی سب سے زیادہ شرح انہی ویلفیئر سٹیٹ میں ہے کہ زندگی کبھی بے جہد نظر آتی ہے اور کبھی بے مقصد۔ بے گھر تو کوئی نہیں ہوتا ہے مگر انسان عجیب شے ہے، اسے سر چھپانے کو صرف چھت نہیں چاہیئے:

ٹھکانے سر چھپانے کو بہت ہیں
مگر اپنا مکاں اپنا مکاں ہے

اسے پیار و محبت کے رشتوں میں جکڑے ہوئے چھوٹے بڑوں والے گھر کی آرزو ہوتی ہے۔ اولڈ ہاؤسز کی نہیں، آزادی کی آرزو ہوتی ہے۔ مگر جب آزادی حدود آشنا ہو جائے تو اجتماعی زندگی میں رُوح کو تازگی دینے کی بجائے پژمردہ کر دیتی ہے۔ اسی لئے وہ اب BEYOND THE WELFARE STATE کی آرزو رکھتے ہیں۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں دو ایسے نابغہ روزگار راہنما ملے۔ یہ ہم پہ قدرت کا ایک خاص انعام تھا۔ ان دونوں کے پیشِ نظر قرآن کا دیا ہوا نظام تھا۔ ایک ایسے معاشرے کا قیام جہاں نہ کوئی بھوکا ننگا ہوگا نہ بے ٹھکانہ اور بے گھر۔ ہر ایک کو تعلیم کے یکساں مواقع اور اپنے مضمر جوہروں کو بروئے کار لانے کی کھلی آزادی۔ ہر ایک کو صلاحیتوں کے مطابق روزگار۔ نہ کوئی اکیلے کو، بے سہارے کو دھتکارے گا اور اسے معاشرے میں اجنبی بنا دے گا۔ جس کا چلتا ہوا کاروبار رُک جائے گا، اس کی روزی کا بندوبست کیا جائے گا، بیمار کو علاج معذور کو سہارا میسر ہوگا وہی ویلفیئر سٹیٹ جو BEYOND THE ویلفیئر سٹیٹ ہوگی جہاں انسانی رشتے قائم رہیں گے۔ حُسن اور توازن کے ساتھ۔ بوڑھے اولڈ ہاؤسز میں بیگانوں کی نگاہِ کرم کے نہیں اپنوں کی حدت بھری فضا میں خود کو بامقصد زندگی گزارتے محسوس کریں گے

مگر ہماری بدبختی کہ ایک راہنما بہت پہلے رخصت ہوگیا اور دوسرا جسے اس نے اس ملّت کے پتوار
…ئے تھے طوفان سے نکال کر اسے ساحلِ مراد تک تو لے آیا۔ مگر اس کے پاؤں اس زمین میں صحیح طور پر
…تے کا گُر سکھانے سے پہلے چلا گیا۔ ہم اسی کو منزل سمجھ کر اپنی اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ کر اصل مقصد
…سے بےخبر ہوگئے اور ۴۲ سال کے بعد بھی آوازیں سنتے ہیں ہم یہاں کیوں آئے تھے۔ ہم نے اس نظام
…کو قائم کرنے کے لئے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جو ان راہنماؤں کے پیشِ نظر تھا اور جسے قائدؒ نے اس قوم کی ذمہ داری
…تھا۔

یہاں وہی نظام قائم رہا وہی غلامی رہی۔ اقبالؒ کہتا تھا "دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں، تیرے
…ی نہیں۔ اور یہاں زمین زمیندار ہی کی ملکیت رہی۔ محنت کش کی محنت کا ماحصل "دانہ ایں می کارد آں
…س برد" کے مصداق وڈیرے کے گھر جاتا رہا۔ وہی چند خاندان جو قیامِ پاکستان کے وقت دولت کے بل پر
…ران تھے حکمران رہے۔ میں نام کیا لوں آپ سب واقف ہیں۔ دل پہ ہاتھ رکھ کر کہیے۔ ان بیالیس سالوں
…میں حکومت کب ان خاندانوں سے باہر گئی ہے یا جانے دی گئی ہے۔ وہی لغاری، وہی مزاری، وہی گیلانی
…قریشی، وہی مخدوم، وہی جتوئی، چانڈیو، تالپور، بھٹو، وہی پیرزادے، وہی وڈے خان اور چھوٹے خان
…قبائلی سردار۔ اب ان میں کوئی اور شامل ہوا ہے تو نو دولیتے ہیروئن فروش، اسلحے کے سوداگر، بلیک اور
…سمگلنگ کے بل پر بنے رئیس اور اب تو ہر ممبر اسمبلی جو پیسے کے بل پہ اسمبلی میں پہنچا ہے اپنی جگہ پہ کسی مغل
…ت کا پنج ہزاری یا ہفت ہزاری ہے جسے اپنے علاقے کے لوگوں پر ہر طرح کا اختیار ہے۔ ہاں جب
…رکار کو ضرورت ہو تو اسے سہارا دے۔ اقبالؒ کے تصوّر کی مملکت میں تو:

کس درایں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

…تھا وہ تو کہتا تھا:

حائل رہیں کیوں خالق و مخلوق میں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

…یہی پیرانِ تسمہ پا ۴۷ سے ۸۸ تک امت کی گردن پر سوار رہے۔ ہاری کا، کاشتکار کا، مزدور کا،
…لکھے بیکار کا کوئی پرسانِ حال نہیں:

بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

…استحصال کا نتیجہ آخر انتشار ہوتا ہے، اسی میں ہم سب مبتلا ہیں۔ دیکھا جائے تو اس وقت سب

پریشان ہیں ۔ اس صورتِ حال سے نکلنا چاہتے ہیں ۔مسائل کی نشاندہی کرو تو لوگ کہتے ہیں وسائل کہاں سے آئیں گے ۔ ہر فورم سے کہہ دیا جاتا ہے تعلیم اتنا بڑا بوجھ ہے کہ حکومت اکیلے اسے نہیں اٹھا سکتی صحت اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ تنہا حکومت اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی ۔ انڈسٹری حکومت صرف اپنے وسائل سے نہیں چلا سکتی ۔ سرمایہ دار ان نیک کاموں میں ہاتھ بٹائے ۔ سرمایہ دار یعنی استحصالی طبقہ جس کا وجود ہی مسائل کو اپنے استعمال میں لانے پر منحصر ہے ۔ وہ کیسے بلا مقصد، بغیر منافع کے، بغیر کسی چیز کو کاروبار چلائیں گے چاہے وہ تعلیم ہو یا صحت ۔ ساری سرمایہ دار دنیا کہتی ہے نفع کا INCENTIVE نہ ہو تو محنت کون کرے گا، کون چاہے گا کہ خون پسینہ تو وہ بہائے اور نتیجے میں حاصل ہونے والی دولت وہ دوسروں کے لئے عام کر دے ۔ یہ دلیل وہ اپنی خوشحالی کے حق ہی میں نہیں، یہی دلیل وہ روس کے نظام کے فیل ہونے کی دلیل میں لاتے ہیں ۔ خود برزنیف نے غالباً ۶۸ء کی عالمی اشتراکی کانفرنس میں کہا تھا کہ ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ نئی نسل کو جس نے استحصال نہیں دیکھا کیا کہہ کر، کس طرح کام پہ اکسائیں ۔ کام نہ ہو گا تو خوشحالی کیسے آئے ۔ نتیجہ جبر اور زبردستی ہی رہ جاتا ہے ۔ وہی ظلم و بربریت، وہی زبردستی جو پہلے انفرادی سطح پر تھی، حکومتی سطح پر بروئے کار آجاتی ہے ۔ انفرادی سطح کے ظلم کے خلاف تو کوئی احتجاج، کسی فورم پہ اپیل بھی ہو سکتی ہے مگر حکومت کے خلاف کوئی کیا کرے ۔ اس طرح پورے کا پورا ملک جیل خانے میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں استحصالی سرمایہ دار دنیا، خود کو آزاد دنیا کہتی ہے ۔

یہ INCENTIVE ۔ یہ جذبۂ محرکہ کیا ہے ۔ یہی نکتہ تھا جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے روس کو مخاطب کر کے سوال کیا تھا؛

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستہ ای اُو را اساسِ محکمے!

یہ اساس محکم نہ ہو ۔ جس درخت کی جڑ گہری اور مضبوط نہ ہو وہ آندھیوں اور بگولوں میں سر بلند ہو کر کھڑا نہیں رہ سکتا ۔ اللہ تعالےٰ نے خود اپنے نظام کی مثال اس شجرِ طیب کی دی ہے جس کی جڑیں زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں گڑی ہوئی ہیں اور شاخیں رُخِ فلک کو چھو رہی ہیں ۔ اسلام زندگی کا ایک فلسفہ دیتا ہے ۔ وحیٔ خداوندی کے مطابق زندگی جوئے رواں ہے، موت (یہ طبعی موت، جسم کی موت) اس کا کچھ نہیں بگاڑتی

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد شد

یہ موت کے بعد اگلی منزلوں کے سفر پہ گامزن ہو جاتی ہے مگر ایک قانون کے تحت، قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت اُس زندگی میں مقامات کا تعین اِس زندگی کے اعمال کرتے ہیں ۔ بہتر عمل، عملِ صالح، وہ عمل جس میں دوسروں کی

گی بہتری ہو۔ جس سے معاشرے میں فساد اور ظلم کی بجائے ہم آہنگی، ہمواری، مسرت، شادمانی، خوشی اور خوشحالی آئے۔ انسان کی ذات کی نشوونما اسی سے ہوتی ہے جو وہ دوسروں کے لئے دیتا ہے۔ عین اسی طرح جس طرح اس کے جسم کی پرورش اسی سے ہوتی ہے جو وہ خود لیتا ہے۔ جب جسم یہاں رہ جائے گا تو یہ ذات آگے بڑھ جائے گی۔ اپنے اعمال کے بل پہ، ناتواں یا توانا، خاسر و نامراد یا کامیاب و کامران۔ کسی کا کوئی عمل بے نتیجہ نہیں رہتا۔ اس کا بدلہ ضرور ملتا ہے۔ جو کچھ انسان بظاہر دوسروں کو دیتا ہے وہ آخرت میں اس سے کئی گنا زیادہ پاتا ہے۔ یہ وہ سودا ہے جس میں گھاٹے کا کوئی امکان نہیں۔

طمانیتِ قلب، اپنے اردگرد، اپنے ماحول کو TENSION سے پاک دیکھنا۔ خوف اور حزن سے نجات کو اگر آپ کل تک نعمتِ خداوندی نہ سمجھتے تھے تو آج تو جان جائیے اس ارضِ پاک میں جس کی تنگ و تاریک گلیوں میں رات کی تاریکی میں بھی آپ کو خوف نہ محسوس ہوتا تھا۔ اس کی شاہراہوں پر بھی چلتے ہوئے آج آپ کا دل ڈر سے دھڑکتا ہے ـــــ سوال ایمان کا ہے کہ طبعی موت زندگی کا انجام نہیں۔ یہ آگے چلے گی، ایسا ہو کر رہے گا۔ یہی ایمان باللہ ہے۔ یہی ایمان بالآخرت ہے۔ یہ دنیا کاروباری ہے تو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ آج کچھ دے کر کل کی خوشحالی خرید رہے ہیں۔

خدا تو خود کھیتی کی مثال دے کر کاروباری دنیا کو سمجھا رہا ہے کہ کسان زمین تیار کر کے بیج ڈال دیتا ہے اس کی رکھوالی کرتا ہے۔ فصل اگتی ہے تو خوش ہوتا ہے مگر فصل میں اس کا حصہ محض محنت ہے۔ سورج کی تمازت، ہواؤں کا رُخ، وقت پر بارش ـــــ اور پھر خود یہ زمین اور اس کے اندر مضمر صلاحیتیں کس کی ودیعت ہے۔ زمین انسان کی ملکیت کیسے ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے زمین پہلے پیدا کی تھی، انسان بعد میں۔ خدا کا کہنا ہے کہ فصل میں سے تم اپنا حصہ، اپنی محنت کے برابر لے لو باقی ہمارا حصہ ہمیں دے دو، ہمیں ـــــ کلیسا کو نہیں، بادشاہ کو نہیں، یہ ضرورتمندوں کا حصہ ہے انہیں دے دو ہمیں پہنچ جائیگا۔

یہ ایمان کی قوت ہے جو انسان کو انفاق پہ آمادہ کرتی ہے۔ اسلام تعمیرِ فرد کرتا ہے۔ پختہ سیرت و کردار کا شخص ہی ذاتی مفادات سے آگے سوچ سکتا ہے۔ مومنوں کی جماعت دراصل انہی پختہ سیرت و کردار کے حامل، ذہنی طور پر بالغ انسانوں کی جماعت ہے۔ یہی لوگ وہ معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ یہی لوگ وہ نظام دے سکتے ہیں جو محدود مفادات سے بلند ہو کر پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے کام کر سکے۔ یہ اس خدا کے سپاہی ہوتے ہیں جس کے نزدیک انسانیت امتِ واحدہ ہے۔ نسل، رنگ، ذات، برادری، زبان کے امتیازات بے معنی ہیں۔ پیدائش کے بل پر کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔ درجات اعمال کے بل پر حاصل ہوتے ہیں اور درجات اقرار کی پاسداری سے حاصل ہو سکتے ہیں ـــــ تاریخ انسانی اس بات کی گواہ ہے۔

پھر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو حاصل کرنے کیلئے ہتھیار اٹھائے اور جانبازی و سرفروشی کی ایک نئی داستان تاریخِ عالم کی داستانوں میں رقم کی۔ تاہم انگریزوں کے جدید جنگی ہتھیاروں اور تازہ دم تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ نہ کر سکے، جنگِ آزادی کو کچلنے کے بعد انگریزوں نے مظالم کی انتہا کر دی تاہم بقول شاعر:

ع بے طاقت و بے زور جو رہتے ہیں زمیں پر
وہ داغ ہیں تذلیل کے ہستی کی جبیں پر

تاہم یہ تذلیل و بربادی ایک صدی تک ہندوستان میں مسلمانوں کا مقدر بنی رہی ـــــ تحریکِ پاکستان کے مقاصد کیا تھے اس کی ایک جھلک ۱۹۵۷ء کی تاریخ کے ایک واقعہ سے عیاں ہے۔ جنگِ آزادی کے ایک مجاہد مولانا کفایت اللہ کافی کو جب بغاوت کے جرم میں انگریز فوجی تختۂ دار کی طرف لے جا رہے تھے تو آپ مسکراتے جا رہے تھے اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے اور یہ شعر ورد زبان کرتے ہوئے آپ نے تختۂ دار پر اپنی جان خدائے محمدؐ کے سپرد کر دی: اور شہادت کے مرتبۂ بلند پر فائز ہوئے!

ے نے گل کوئی رہے گا نے چمن باقی رہے گا
پر رسولؐ اللہ کا دینِ حسین باقی رہے گا

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

مولانا شہید کا مقصد یہی تھا کہ مسلمان کا مقصدِ حیات اس دنیا میں رسولؐ اللہ کے دینِ حسین کو ہی باقی رکھنا ہے۔ اسی لئے اپریل ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمبئی میں مسلم لیگ نے جو منشور اور پروگرام مرتب کیا اس کی پہلی شق میں ہی لکھا گیا کہ مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت

شق نمبر ۱ ـــــ اردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت کرنا۔

" " ۱۲ ـــــ مسلمانوں کی حالت کو عمومی حیثیت سے بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کرنا۔

انگریزوں نے ہندوستان کی سلطنت چونکہ مسلمانوں سے چھینی تھی اسلئے انہوں نے مسلمانوں کو ہر سطح پر کچلنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ہندوستان کے ہندو جنہوں نے مسلمانوں کے ہزار سالہ دورِ حکومت میں ہر طرح کے مزے لوٹے تھے لیکن دل میں مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف انگریزوں سے گٹھ جوڑ کر لیا اور فرمانِ خداوندی کی سچائی پر اپنے عمل سے مہر ثبت کر دی کہ "کفر ملت واحدہ ہے" اور ان اسلام دشمن قوتوں نے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں ذلیل و رسوا کیا، نہ تو مسلمانوں کے پاس زراعت رہی اور نہ ہی تجارت۔ انہیں معاشی بدحالی کے گہرے گڑھوں میں دھکیل دیا گیا، اور محض ان کے مسلمان ہونے کی بناء پر انہیں "گھسیارے" بنا دیا گیا، اور ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف انگریز اور ہندو نے

کس کھٹ جوڑ کو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک قائم رکھا اور ریڈکلف نے اپنی تاریخی بد دیانتی کے سبب ان کے ۳ جون ۱۹۴۷ء کے انڈین نیشنل کانگریس، برطانوی گورنمنٹ اور مسلم لیگ کے درمیان طے شدہ سمجھوتہ کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں کو مشرقی پنجاب، بنگال، آسام اور کشمیر سے محروم کر دیا۔

بنگال کی تقسیم اور پھر تنسیخ کے بعد سنہ ۱۹۰۶ء میں نواب آف ڈھاکہ نواب سلیم اللہ خاں اور نواب وقار الملک، راجہ محمود آباد اور دیگر اس دور کے اکابرین ملت نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی جس کے منشور میں ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ الہندی مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کو برقرار رکھا جائے۔

پھر سیاسی ارتقاء کے ساتھ ساتھ، ہندی مسلمانوں کے مطالبات اور مقاصد بھی بدلتے گئے۔ اس لئے کہ برطانوی حکومت ہندوؤں کو مٹھی میں لینا چاہتی تھی تاکہ مسلمانوں سے غدر کے باغیانہ اقدامات کا انتقام لیا جائے۔ ہندو ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے محکوم رہ چکے تھے۔ وہ بھی مسلمانوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ مسلمان مغلوب و محکوم ہوں، اور وہ حاکم اور غالب کی زندگی بسر کریں۔ انگریزوں نے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی اور مسلمانوں کی ہمت شکنی کی پالیسی اختیار کی۔

لارڈ کرزن نے جو وائسرائے ہند تھا، اس نے "محکمہ آثارِ قدیمہ" قائم کر کے ہندوستان کی تاریخی عمارات کا تحفظ کیا۔ اس لئے مسلمانوں کے عہدِ حکومت کی تاریخی یادگاریں، ہندوؤں کے ہاتھوں منہدم اور برباد ہونے سے بچ گئیں۔

لارڈ کرزن نے ہی سنہ ۱۹۰۸ء میں تقسیم بنگال کا اعلان کیا جس سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے معاشی حالات درست ہونے لگے مگر ہندو یہ کب گوارا کرتے تھے کہ مسلمان معاشی طور پر مضبوط ہوں۔

انہوں نے تقسیم بنگال کو ختم کرانے کے لئے پُرزور ایجی ٹیشن کی اور آخر سنہ ۱۹۱۱ء کے دہلی کے دربار کے موقعہ پر برطانوی حکومت نے تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا ــــ ہندو مسلمانوں کے علیحدہ قومیت کے دشمن تھے۔ وہ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کے داعی تھے۔ اس لئے وہ ہمیشہ جداگانہ انتخابات کی مخالفت کرتے رہے اور وہ اردو زبان کو بھی ہندوؤں کے دورِ غلامی کی یادگار سمجھتے تھے۔ اس لئے اردو کی بجائے ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان کا درجہ دے کر اردو زبان کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ ہندو اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز تھے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کو کسی غیر سرکاری دفتر میں گھسنے نہ دیتے تھے۔ جب کبھی انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوا مسلمان امیدوار اس لئے ہرایا گیا کہ وہ مسلمان تھا۔ جب عہدوں اور منصبوں کی تقسیم پر بحث ہوئی، مسلمانوں کو اس لئے حقیر و ناکارہ سمجھا

پھر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو حاصل کرنے کیلئے ہتھیار اٹھائے اور جانبازی و سرفروشی کی ایک نئی داستان تاریخِ عالم کی داستانوں میں رقم کی۔ تاہم انگریزوں کے جدید جنگی ہتھیاروں اور تازہ دم تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ نہ کر سکے، جنگِ آزادی کو کچلنے کے بعد انگریزوں نے مظالم کی انتہا کر دی، تاہم بقول شاعر:

ع بے طاقت و بے زور جو رہتے ہیں زمیں پر
وہ داغ ہیں تذلیل کے ہستی کی جبیں پر

تاہم یہ تذلیل و بربادی ایک صدی تک ہندوستان میں مسلمانوں کا مقدر بنی رہی ـــــ تحریکِ پاکستان کے مقاصد کیا تھے اس کی ایک جھلک ۱۹۵۷ء کی تاریخ کے ایک واقعہ سے عیاں ہے۔ جنگِ آزادی کے ایک مجاہد مولانا کفایت اللہ کافی کو جب بغاوت کے جرم میں انگریز فوجی تختۂ دار کی طرف لے جا رہے تھے تو آپ مسکراتے جا رہے تھے اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے اور یہ شعر ورد زبان کرتے ہوئے آپ نے تختۂ دار پر اپنی جان خدائے محمدؐ کے سپرد کر دی: اور شہادت کے مرتبۂ بلند پر فائز ہوئے!

ے نے گل کوئی رہے گا، نے چمن باقی رہے گا
پر رسولؐ اللہ کا دینِ حسین باقی رہے گا

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

مولانا شہید کا مقصد یہی تھا کہ مسلمان کا مقصدِ حیات اس دنیا میں رسولؐ اللہ کے دینِ حسین کو ہی باقی رکھنا ہے۔ اسی لئے اپریل ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمبئی میں مسلم لیگ نے جو منشور اور پروگرام مرتب کیا اس کی پہلی شق میں ہی لکھا گیا کہ مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت

شق نمبر ۱ ـــــ اردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت کرنا۔
" " ۱۲ ـــــ مسلمانوں کی حالت کو عمومی حیثیت سے بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کرنا۔

انگریزوں نے ہندوستان کی سلطنت چونکہ مسلمانوں سے چھینی تھی اسلئے انہوں نے مسلمانوں کو ہر سطح پر کچلنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ہندوستان کے ہندو جنہوں نے مسلمانوں کے ہزار سالہ دورِ حکومت میں ہر طرح کے مزے لوٹے تھے لیکن دل میں مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف انگریزوں سے گٹھ جوڑ کر لیا اور فرمانِ خداوندی کی سچائی پر اپنے عمل سے مہر ثبت کر دی کہ "کفر ملت واحدہ ہے" اور ان اسلام دشمن قوتوں نے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں ذلیل و رسوا کیا، نہ تو مسلمانوں کے پاس زراعت رہی اور نہ ہی تجارت۔ انہیں معاشی بدحالی کے گہرے گڑھوں میں دھکیل دیا گیا، اور محض ان کے مسلمان ہونے کی بناء پر انہیں "گھسیارے" بنا دیا گیا، اور ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف انگریز اور ہندو نے

اس گٹھ جوڑ کو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک قائم رکھا اور ریڈکلف نے اپنی تاریخی بددیانتی کے سبب ان کے ۳ جون ۱۹۴۷ء کے انڈین نیشنل کانگریس، برطانوی گورنمنٹ اور مسلم لیگ کے درمیان طے شدہ سمجھوتہ کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں کو مشرقی پنجاب، بنگال، آسام اور کشمیر سے محروم کر دیا۔

بنگال کی تقسیم اور پھر شیخ کے بعد ۱۹۰۶ء میں نواب آف ڈھاکہ نواب سلیم اللہ خاں اور نواب وقار الملک، راجہ محمود آباد اور دیگر اس دور کے اکابرینِ ملت نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی جس کے منشور میں ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ الہندی مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کو برقرار رکھا جائے۔

پھر سیاسی ارتقاء کے ساتھ ساتھ، ہندی مسلمانوں کے مطالبات اور مقاصد بھی بدلتے گئے۔ اس لئے کہ برطانوی حکومت ہندوؤں کو مٹھی میں لینا چاہتی تھی تاکہ مسلمانوں سے غدر کے باغیانہ اقدامات کا انتقام لیا جائے۔ ہندو ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے محکوم رہ چکے تھے۔ وہ بھی مسلمانوں کو پیچھے ہٹا کر آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ مسلمان مغلوب و محکوم ہوں، اور وہ حاکم اور غالب کی زندگی بسر کریں۔ انگریزوں نے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی اور مسلمانوں کی ہمت شکنی کی پالیسی اختیار کی۔

لارڈ کرزن نے جو وائسرائے ہند تھا، اس نے "محکمہ آثارِ قدیمہ" قائم کر کے ہندوستان کی تاریخی عمارات کا تحفظ کیا۔ اس لئے مسلمانوں کے عہدِ حکومت کی تاریخی یادگاریں، ہندوؤں کے ہاتھوں منہدم اور برباد ہونے سے بچ گئیں۔

لارڈ کرزن نے ہی ۱۹۰۸ء میں تقسیم بنگال کا اعلان کیا جس سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے معاشی حالات درست ہونے لگے مگر ہندو یہ کب گوارا کرتے تھے کہ مسلمان معاشی طور پر مضبوط ہوں۔

انہوں نے تقسیم بنگال کو ختم کرانے کے لئے پُرزور ایجی ٹیشن کی اور آخر ۱۹۱۱ء کے دہلی کے دربارِ عام کے موقعہ پر برطانوی حکومت نے تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا ـــــ ہندو مسلمانوں کے علیحدہ قومیت کے دشمن تھے۔ وہ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کے داعی تھے۔ اس لئے وہ ہمیشہ جداگانہ انتخابات کی مخالفت کرتے رہے اور وہ اردو زبان کو بھی ہندوؤں کے دورِ غلامی کی یادگار سمجھتے تھے۔ اس لئے اردو کی بجائے ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان کا درجہ دے کر اردو زبان کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ ہندو اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز تھے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کو کسی غیر سرکاری دفتر میں گھسنے نہ دیتے تھے۔ جب کبھی انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوا مسلمان امیدوار اس لئے ہرایا گیا کہ وہ مسلمان تھا۔ جب عہدوں اور منصبوں کی تقسیم پر بحث ہوئی، مسلمانوں کو اس لئے حقیر و ناکارہ سمجھا

گیا، کہ وہ مسلمان تھے۔ جب زبان کا معاملہ زیرِ بحث آیا۔ اردو اس لئے مردود قرار دی گئی کہ وہ مسلمانوں کے عہد حکومت کی یادگار تھی۔ یہ حقائق تھے جنھوں نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے لئے بحیثیت مسلمان کے۔ بحیثیت ایک جداگانہ قوم کے اپنے مستقل ملّی وجود کو ہندوستان میں قائم رکھنے کیلئے متحد و منظم ہو کر کام کریں۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا۔

دسمبر ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ مسٹر مظہر الحق بیرسٹرایٹ (پٹنہ) نے صدارت کی۔ اس اجلاس کی کارروائی کا ماحصل بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کا جداگانہ وجود محفوظ رہے۔

۲۱ دسمبر ۱۹۱۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا جو اجلاس، مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس کا ماحصل بھی یہ تھا کہ مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کر دی جائیں۔

مسٹر محمد علی جناح نے ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کی ہندوستان میں آمد پر جو چودہ نکات مرتب کئے تھے۔ ان کی بارھویں شق کے الفاظ یہ ہیں:

"دستور اساسی میں ایسے کافی تحفظات رکھے جائیں، جن کی رُو سے اسلامی کلچر، اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت، ترقی، اور مسلمانوں کی زبان، رسم الخط اور مذہبی پرسنل لاء اور اسلامی اداروں کی ترقی و حمایت کے لئے حکومت کے دوسرے اداروں سے مناسب حصّہ حاصل کیا جائے۔"

خواتین و حضرات! آپ نے میری ان معروضات سے محسوس کر لیا ہوگا اور آپ کے ذہن نشین ہو گیا ہوگا۔ کہ تحریکِ پاکستان کے مقاصد کیا تھے؟

جب ہر طریقہ آزمانے کے باوجود بھی ہندوستان کے ہندو راہِ راست پر نہ آئے اور وہ مسلمانانِ ہند کو "انگریزی جمہوریت" کے ماتحت سے ہمیشہ کیلئے اپنا "غلام" بنانے پر ڈٹے رہے۔ تب ۱۹۳۰ء کے الٰہ آباد کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ نے مسلمانوں کو "علیحدہ وطن" کا نظریہ دیا، اور ان علاقوں کی نشاندہی کر دی جو "مسلم انڈیا" بننے کا حقدار تھا اور آخر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو علامہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کیلئے مسلمانانِ برصغیر نے قرار دادِ لاہور منظور کی جسے بعد میں "قرار دادِ پاکستان" کا تاریخی نام دیا گیا۔ اور یہ سال قرار دادِ لاہور کی گولڈن جوبلی کے طور پر منایا جا رہا ہے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے ۲ نومبر ۱۹۴۱ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب میں فرمایا:

"حال ہی میں مجھے بہت سے ہندوؤں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ ازراہِ مہربانی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں نے بغیر کسی دل شکنی کے ان سے پوچھا تھا۔ ہندوؤں

کو حکومت کیے کتنا عرصہ گزرا؟ اور ہندوستان کے کس حصّہ پر انہوں نے حکومت کی تھی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال سے ہندوؤں نے ملک کے کسی قابلِ ذکر حصّہ پر حکومت نہیں کی ہے۔ ہماری تجویز کی رُو سے تین چوتھائی ہندوستان ان کو دیا جا رہا ہے جہاں وہ اپنی حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ میں نے ان سے اپیل کی کہ وہ حریص نہ بنیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہیر پھیر سے سارے ملک کو ہتھیا لینا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں، یہ تین چوتھائی لے لو اور میری ایک چوتھائی پر حسد نہ کرو۔ مجھے اپنی اسلامی تاریخ کی روشنی میں اپنی روایات، اپنی ثقافت اور اپنی زبان کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی بسر کرنے دو۔"

خواتین و حضرات! قائدِ اعظمؒ نے ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو مرکزی اسمبلی اور تمام صوبائی مجالس آئین ساز کے مسلم ممبروں کا ایک کنونشن دہلی میں طلب کیا اور ایک مرتبہ پھر پاکستان کا مطالبہ کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ سب ممبران نے ایک حلف نامے پر دستخط کیے، جس پر خود قائدِ اعظمؒ نے بھی دستخط کیے۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے ہر باشعور مسلمان تحریک پاکستان کے مقاصد کو نہایت آسانی سے سمجھ جائے گا۔

حلف نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

"کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کیلئے ہے"

میں ــــــــ رکنِ مسلم لیگ صوبائی لیجسلیٹو اسمبلی/کونسل صوبہ ــــــــ

اپنے اس پختہ عہد کا اعلان کرتا ہوں کہ برّ کوچک ہند میں بسنے والی مسلم قوم کی نجات، اس کی سلامتی، اس کا تحفظ اور اس کا مستقبل حصولِ پاکستان میں مضمر ہے اور پاکستان ہی اس وسیع برّ کوچک کے پیچیدہ دستوری مسائل کا حل ہے، باوقار اور معقول حل ہے اور اسی کے ذریعہ یہاں بسنے والی تمام قوموں اور فرقوں کو امن آزادی اور خوشحالی حاصل ہو سکتی ہے۔ میں بہ صمیم قلب اقرار کرتا ہوں کہ اس مقصدِ عزیز یعنی پاکستان کو حاصل کرنے کیلئے آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے جو تحریک بھی رُو بہ عمل لائی جائے گی اور اس سلسلہ میں جو ہدایات و احکام جاری کیے جائیں گے میں بلا پیش و پس کمالِ رضامندی کے ساتھ، ان کی پوری پوری تعمیل کروں گا، اور اس امر کا کامل

یقین رکھتے ہوئے کہ میرا مقصد و مدعا حق و انصاف پر مبنی ہے۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اس راہ میں جو خطرات اور آزمائشیں پیش آئیں گی اور جن قربانیوں کا مطالبہ ہوگا انہیں برداشت کروں گا:

رَبَّنَا افْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ

"اے پروردگار! ہمیں صبر و استقامت دے ہمیں ثابت قدم رکھ اور قومِ کفار پر ہمیں فتح و نصرت عطا فرما"

دستخط ---------- مؤرخہ ----------

اس حلف نامہ پر دستخط کرنے سے دوسرے روز قائدِ اعظمؒ نے ایک پُرجوش تاریخی خطاب

"ہم کس لئے جدّوجہد کر رہے ہیں؟ ہمارا نصب العین کیا ہے؟ ہمارا مقصد تنگ نظری اور تعصب نہیں، ہم ایسی مملکت کا قیام نہیں چاہتے جو تنگ نظری اور مذہبی تعصب پر قائم ہو۔ مذہب ہم کو انتہائی محبوب ہے۔ مذہب کے مقابلہ میں تمام دنیاوی چیزیں ہمارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، لیکن ہمارے دوسرے امور بھی جو ملی زندگی کے لئے اہم اور ناگزیر ہیں مجلسی زندگی اور اقتصادی زندگی بھی قوم کے لئے بہت ضروری ہوتی ہے۔ سیاسی قوت کے بغیر آپ اپنے مذہب کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے! اور آپ کی اقتصادی زندگی کا تحفظ بھی نہیں ہو سکتا۔"

قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:

"ہم مسلمانوں کو خدا کے فضل سے بہت سی چیزیں حاصل ہیں۔ ہمارے پاس دماغ، فہم، ادراک قابلیت اور ہمت موجود ہے۔ یہی وہ تمام خصوصیتیں ہیں جو قوموں کو حاصل کرنی ضروری ہیں لیکن ہماری راہ میں کچھ دشواریاں حائل ہیں۔ ہم گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے غیر ملکی اقتدار اور ہندو غلبہ کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ برطانیہ اور ہندوؤں کے اس میل نے ہماری حالت پر ضرر رساں اثر ڈالا ہے جس سے ہماری مذکورہ صلاحیتوں کو نقصان پہنچا ہے۔ کردار کسے کہتے ہیں؟ کردار کا مطلب یہ ہے کہ عزتِ خود داری، ارادہ اور عزم کی پختگی دیانت داری ان تمام خصوصیات کا بدرجۂ اتم موجود ہونا بلندیٔ کردار ہے۔ قوم کے اجتماعی مفاد کے افراد کا اپنے آپ کو قربان کر دینے کیلئے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہنا اچھا کردار ہے۔"

تحریکِ پاکستان کے مقاصد کیا تھے ؟ حرفِ آخر کے لئے میں ۱۱ جولائی ۱۹۴۶ء کو حیدر آباد دکن کے ایک اجتماع میں قائدِ اعظمؒ کی تقریر کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ آپ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا !

" اس وقت میدانِ سیاست میں ہندو مسلمانوں کی جنگ ہو رہی ہے، لوگ پوچھتے ہیں کون فتحیاب ہو گا۔ علمِ غیب خدا کو ہے ۔ لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے علی رؤس الاشہاد کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی راہبر بنا کر شیوہ صبر و رضا پر کاربند رہیں اور اس ارشادِ خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی ایک طاقت یا کئی طاقتوں کا مجموعہ بھی مغلوب نہیں کر سکتا۔ ہم تعداد میں کم ہونے کے باوجود فتح یاب ہوں گے اور اسی طرح فتحیاب ہوں گے جس طرح کہ مٹھی بھر مسلمانوں نے ایران و روم کی سلطنتوں کے تخت الٹ دیئے تھے "

قائدِ اعظمؒ کا افسرانِ حکومت سے خطاب ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء :

" قیامِ پاکستان جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے جدوجہد کر رہے تھے ۔ خدا کا شکر ہے آج ایک مسلمہ حقیقت ہے ۔ اپنے لئے ایک مملکت قائم کرنا ہی ہمارا مقصود نہیں تھا ، بلکہ یہ ذریعہ تھا ، حصولِ مقصد کا ، خیال یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کے مالک ہوں ، جہاں ہم اپنی روایات اور تمدنی خصوصیات کے مطابق ترقی کر سکیں ۔ جہاں اسلام کے عدل و مساوات کے اصولوں کو آزادی سے برسرِ عمل آنے کا موقع حاصل ہو "

قائدِ اعظمؒ نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا !

" اس وقت میں آپ سے صرف اس بات کا طلب گار ہوں کہ میرا یہ پیغام جس جس شخص کے پاس پہنچے وہ اپنے دل میں اس بات کا عہد کرے کہ ضرورت پڑنے پر وہ پاکستان کو اسلام کی پشت پناہ اور دنیا کی عظیم ترین قوم بنانے کے لئے جس کا نصب العین امن و آشتی ہو ۔ اندرونِ ملک بھی اور بیرونِ ملک بھی ۔ مسلمان کے لئے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نجات نہیں ہو سکتا کہ وہ حق کی خاطر شہید ہو جائے "

خواتین و حضرات ! آئیے بانیٔ پاکستان اور ان کے جانثار ساتھیوں اور سپاہیوں کے حاصل کردہ اس عطیۂ خداوندی چمنستان پاکستان کو اتحاد ، ایمان اور نظم و ضبط کے سنہرے اصولوں پر کاربند ہو کر لسانی ، صوبائی ، فرقہ واریت کے زہر سے پاک کر کے ایک قوم کی حیثیت سے قرآن و سنت کی روشنی میں تحریکِ پاکستان کے مقاصد کی تکمیل کر کے مملکت خداداد پاکستان کو ایک جمہوری اسلامی اور فلاحی مملکت بنا کر شہدائے پاکستان اور بانیٔ پاکستان کے حضور سرخرو ہوں اور اس ملک میں خداوند تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کے محبوب پاکؐ کی عظمت کے گیت گائیں اور اسے اسلام کا مضبوط ترین قلعہ بنا دیں ۔

خطاب جناب بشیر احمد عابد صاحب (ریاض سعودی عرب)

تحریکِ پاکستان

محترم صاحب صدر و عزیزانِ گرامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ، یہ حکم ادارہ طلوعِ اسلام کی مجلسِ منتظمہ نے دیا ہے۔ یعنی یہ کہ میں تحریکِ پاکستان اور اس کے حقیقی مقاصد پر روشنی ڈالوں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ پابندی بھی عائد کر دی گئی کہ اذان لمبی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس کے مطابق مجھے کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ الفاظ استعمال کرنے ہیں۔ اس معیار پر پورا اترنے کے لئے جتنی علمی وسعت درکار ہوتی ہے وہ تو میرے بس کی بات نہیں البتہ کوشش کروں گا کہ اپنی گفتگو کو وقتِ مقررہ سے ایک منٹ پہلے سمیٹ لوں، تاکہ میرے وہ احباب جو زیادہ صلاحیتوں کے حامل ہیں انہیں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے پورا پورا وقت مل جائے۔ میری اس کوشش سے ظاہر ہے کہ سوائے خامہ فرسائی کے آپ احباب کو کیا حاصل ہوگا۔ اسی لئے کچھ پیش کرنے سے پہلے ہی سراحساسِ ندامت سے جھکا جا رہا ہے۔ اگر کوئی کوتاہی ہو جائے یا تشنگی باقی رہ جائے تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ ادارہ طلوعِ اسلام کے مطابق آج کی یہ تقریب قراردادِ پاکستان کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں منعقد کی گئی ہے۔

میرا تعلق پاکستانی قوم کی اس پود سے ہے جس نے جب آنکھ کھولی تو سبز ہلالی پرچم پاکستان کے چپے چپے پر لہرا رہا تھا، گلی گلی کوچے کوچے کشورِ حسین شاد باد کے مترنم نغمے گونج رہے تھے، اور آزادی کی بھینی بھینی مہک فضاؤں کو معطر کر رہی تھی۔ لہٰذا میں اس قابل تو نہیں کہ اس ملک کو حاصل کرنے کیلئے ہمارے راہنماؤں نے جو قربانیاں دیں انہیں پورے دردِ دل کے ساتھ محسوس کر سکوں۔ البتہ اس ملک کو حاصل کرنے کے بعد جو مقاصد سامنے آئے ہیں اور ان کے حصول کے لئے ہمارے راہنماؤں نے جو جدوجہد شروع کر رکھی ہے، اس کے ایک ایک پہلو پر دلِ خون کے آنسو روتا ہے مجھے اس ضمن میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت پاکستان کے در و دیوار پر خون کے چھینٹے پڑے ہیں۔

آپ کسی کے پاس رُک جائیے، وہ چھینٹا خود بتا دے گا کہ اسے کس مقصد کے حصول کے لئے بہایا گیا ہے۔ مذہبی تفرقہ بازی، سیاسی ہلڑ بازی، معاشی چالبازی حتیٰ کہ پتنگ بازی تک بے دریغ گردنیں، اڑائی جا رہی ہیں۔ کہیں بموں کے دھماکے انسانوں کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا رہے ہیں۔ کہیں کلاشنکوفیں پوپ کارن کی طرح بھون رہی ہیں اور کہیں چھُرے انسانوں کو مُرغِ بسمل بنا رہے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ پوری قوم بازی گروں پر مشتمل ہے اور ہر ایک کا مقصد بازی جیتنا ہے خواہ کسی بھی قیمت پر کیوں نہ ہو! کیا یہی تھے وہ نیک مقاصد جن کے لئے اس سرزمین کو حاصل کیا گیا تھا۔

لاکھوں جانیں تہہ تیغ ہوئیں، لاکھوں بیوائیں ہوئیں اور لاکھوں معصوم کرپانوں کی نظر ہوئے۔ کیا یہی وہ سرزمین ہے جس کے امن، خوشحالی اور حفاظت کے لئے خدائے ذوالجلال کا سایہ طلب کیا جاتا ہے؟

عزیزانِ گرامی! یقیناً آپ سب اپنے سر نفی میں ہلائیں گے۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں۔ اتنا تکلف تو وہ بھی برتتے ہیں جو اس خونریزی اور فساد انگیزی کا باعث یا تو خود ہوتے ہیں یا دوسروں سے کرواتے ہیں۔ ہم جو یہاں اکٹھے ہوئے ہیں تو ہمیں ایک قدم آگے بڑھکر دیکھنا ہوگا کہ حقیقت کیا ہے؟

تحریکِ پاکستان کے مقاصد بھلے کچھ ہوں لیکن یہ بات میں نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ فساد انگیزی اور خونریزی مقصد قطعی نہیں تھا۔ یہ مُلک ہم نے امن اور خوشحالی کے لئے حاصل کیا تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ ایک برصغیر کیا پوری دنیا اس وقت جس بدامنی اور بدحالی کا شکار ہے اس کا حل ہمارے پاس ہے۔ لیکن اس حل کو پیش کرنے کے لئے ہمیں ایک خطۂ زمین چاہیئے تھا۔ تاکہ ہم عملی طور پر ثابت کر سکتے کہ امن اور خوشحالی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ حل قرآنِ کریم تھا۔ اس کتابِ عظیم کا دعویٰ ہے کہ جو بھی اس کے تابع زندگی بسر کریگا لا خوفٌ علیہم ولا ہم یحزنون۔ اور خوف و حزن سے مامونیت، امن اور خوشحالی کی ضمانت ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد یہ کتابِ عظیم ہماری اسمبلی کے روسٹرم پر ہوتی اور جو بل بھی پیش کیا جاتا وہ اس کے اصولوں کی بنیاد پر پاس ہوتا، لیکن ہُوا اس کے برعکس! نتیجتہً ہم امن و خوشحالی سے تو محروم ہوئے، ساتھ کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی سزا بھی پائی۔ سزا یہ ہے کہ جو لوگ بھی اس کے قوانین کی خلاف ورزی اور تکذیب کریں گے۔ اولٰئک اصحٰب النار۔ دیکھ لیجئے! ہر طرف نفرت، حسد اور انتقام کی آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ ایک فرد بھی ایسا نہیں جو اس سے محفوظ ہو۔ یہ آگ صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں بھڑکی ہوئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں اس کی شدت کچھ زیادہ ہے اور ہونی بھی چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ قوم اس پیغام کی نقیب ہے، لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتی۔ ایسے لوگ قرآنِ کریم کے مطابق منافق کہلاتے ہیں۔ یعنی زبان سے تو اقرار کریں لیکن دل کسی اور جانب ہو۔ اور منافقین

کی سزا درک الاسفل من النار ہے۔ آگ کے سب سے نچلے درجے میں۔ ہم بحیثیت منافقین آگ کے نچلے درجے میں جل رہے ہیں۔ آج ہمارے مفکر دانشور، سیاسی مدبر اور مذہبی پیشوا سر پکڑ کر بیٹھتے ہیں کہ اس آگ سے نکلنے کا حل کیا ہے؟ اس ضمن میں ہر طرح کی تجویزوں، مشوروں اور دلائل پر غور و خوض ہوگا لیکن کسی کو بھی خیال تک نہیں آئے گا کہ ہر مشکل کا ایک حل خدا نے بھی تجویز کر رکھا ہے ایک نظر اسے بھی دیکھ لیا جائے۔ آپ کوئی اخبار۔ کوئی رسالہ۔ یا کوئی رپورٹ اٹھا کر دیکھ لیجئے، شاید ہی آپ کو یہ ملے کہ اس معاملے میں خدا کا کیا فیصلہ ہے۔ ہم قرآن کریم کو ضابطۂ حیات تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا تقاضا تھا کہ ہماری ہر بات اور ہمارا ہر عمل اس کے تابع ہوتا۔ ہماری تحریریں اور تقریریں قرآنی آیات سے مزین ہوتیں۔ جس شدت سے ہم اپنے بزرگوں کا ذکر کرتے ہیں، بات بات پر ان کے حوالے دیتے ہیں، قدم قدم پر ان کی تعلیمات کو مشعل راہ بناتے ہیں۔ خدا نے کہا تھا کہ اس سے کہیں زیادہ شدت سے میرا ذکر کرنا اور اس ذکر سے مراد تھی کہ قرآن کریم کے احکامات اور تعلیمات کو ہمیشہ مدنظر رکھنا۔ جملہ امور کے فیصلے اسی کے مطابق کرنا اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو نہ صرف کافر و فاسق کہلاؤ گے بلکہ ظالم بھی بن جاؤ گے۔ اور یاد رکھو! جب کوئی قوم ظلم پر اتر آتی ہے تو پھر وہ کتنا ہی اعلیٰ بیج کیوں نہ ڈالے اس کی کھیتی کبھی نہیں پنپے گی۔ انہ لا یفلح الظالمون۔ دیکھ لیجئے! آج ہم طرح طرح کے بیج بو رہے ہیں۔ لیکن پنپنا تو رہا ایک طرف کوئی اگنے کا نام بھی نہیں لے رہا۔

میں آپ کو زیادہ پیچھے نہیں لے جانا چاہتا۔ یہ جو ہم نے جمہوریت کی تازہ ترین فصل کاشت کی ہے اسی کے انجام کو دیکھ لیجئے! ظالموں کی کاشت کاری ایسی ہی ہوا کرتی ہے اور قرآن کریم کے نزدیک ظالم وہ ہیں من لم یحکم بما انزل اللہ ـــــ جو قرآن کریم کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ـــــ

اگرچہ ہر مسلمان اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ ہمیں قرآن کریم کے مطابق فیصلے کرنے چاہئیں۔ یہ ملک اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ ہم قرآن کریم کے مطابق ایک نظام تشکیل دے سکیں تاکہ ہر فرد امن و خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود اس پر عمل نہیں ہو رہا۔ عموماً اسے ایمان کی کمزوری کہا جاتا ہے اور ایمان کی کمزوری کی وجہ خواہشات نفس کا غلبہ بتایا جاتا ہے۔ اور جب اس غلبے کی وجہ بتائی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کی فطرت ہے۔ اس سے آگے سوال کیا جائے تو اس کا پہلے تو کوئی ٹھوس جواب ہی نہیں بن پاتا۔ اور اگر کوئی جواب دینا بھی چاہے تو وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہے گا کہ یہ فطرت اس لئے ہے کہ لوگ قرآن کریم پر غور نہیں کرتے۔ یعنی پھر پھر کر اسی مشکل میں پھنس جاتا ہے، بات دراصل یہ نہیں، قرآن کریم پر غور نہ کرنے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک اکثریت خواہ ہم ہوں

یا اہلِ زبان از خود قرآنِ کریم کو سمجھنے کے قابل ہی نہیں۔ یہ سب سنی سنائی باتوں پر عمل پیرا ہیں اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں وہی کچھ سنایا جاتا ہے جو کہ سنانیوالے کے مفاد میں ہوتا ہے اور اسی طرز پر سنایا جاتا ہے جس سے اس کے مفاد کا زیادہ سے زیادہ تحفظ ہو سکے۔ اسے سادہ الفاظ میں یوں سمجھئے کہ قرآنِ کریم کے بارے میں ہمیں اتنا ہی علم دیا جاتا ہے اور اسی نہج پر جس طرح کہ آج کل سگریٹ فروش ہمیں سگریٹ نوشی سے منع کرتے ہیں ایک نہایت خوبصورت پیکٹ پر، نہایت باریک الفاظ میں، انتہائی شدید تنذیر لکھی ہوتی ہے کہ جنرل فزیشن کے حکم کے مطابق سگریٹ پینا آپ کی صحت کیلئے مُضر ہے۔ اس ٹیکنیک کا جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس پر کسی لمبے چوڑے تبصرے کی ضرورت نہیں ہمیں قرآن سنانے اور سمجھانے والوں نے کچھ ایسی ٹیکنیک اختیار کر رکھی ہے۔ نتیجتہً جو حشر فزیشن کی وارننگ کا ہوتا ہے وہی قرآنِ کریم کی تنذیرات کا۔ لوگ تسلیم بھی کرتے ہیں اور ساتھ کے ساتھ خلاف ورزی بھی۔ اس کا صرف اور صرف ایک حل ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ از خود قرآنِ کریم کو سمجھ سکیں۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، قرآنِ کریم پہ کبھی عمل نہیں ہو سکے گا اور ہم اسی طرح مصائب و مشکلات میں اُلجھے رہیں گے۔

تحریکِ پاکستان کا یہ بنیادی مقصد تھا کہ پاکستان حاصل کر کے اس میں قرآنِ کریم کے مطابق نظامِ حکومت قائم کیا جائے۔ اس تحریک کے پہلے مرحلے میں یعنی حصولِ پاکستان کی جدوجہد کے دوران تحریکِ طلوعِ اسلام نے بھرپور کردار ادا کیا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اس تحریک کے بانی علامہ غلام احمد پرویزؒ اور محترم قائداعظمؒ کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ قائداعظمؒ ہر قدم قرآنِ کریم کے مطابق اٹھاتے اور یہ قدم کہاں رکھنا ہوتا تھا اس کی نشاندہی علامہ پرویزؒ کرتے تھے۔ پاکستان حاصل کرنے کے بعد قوم کو اس قابل بنانا تھا کہ وہ قرآنِ کریم کے مطابق فیصلے کر سکے۔ آج یہ بارِ گراں بھی اسی تحریک کو اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اس کے کارکن نہایت تندہی اور خلوص سے اپنے فرائض کو سرانجام دے رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کی ہمتوں میں اضافہ فرمائے اور ان کی کوششوں کو بار آور۔

اور آخر میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں۔ اپنی بے بضاعتی اور بے تُکے پن پر۔ اگر کسی کی سمع خراشی ہوئی ہو تو معاف رکھئے گا۔ آپ احباب نے جس حوصلے اور سکون سے سنا اس کے لئے تہہ دل سے مشکور ہوں۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

اگرچہ ہمارے ہاں الفاظ اور معانی کے استعمال میں کوئی خاص امتیاز نہیں برتی جاتی۔ تاہم ادارہ

طلوعِ اسلام کی ایک خوبی سے میں اچھی طرح واقف ہوں کہ یہ الفاظ کا استعمال نہایت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اگر گولڈن جوبلی سے ان کی مراد ان الفاظ کے حقیقی معنی ہیں تو پھر میں انہیں بصد احترام یاد دلاتا چلوں کہ ہماری تاریخ کے گزشتہ پچاس سال ان معانی کی صحیح عکاسی نہیں کرتے۔ یہ عرصہ نہ تو گولڈن رہا ہے اور نہ ہی ہم اس پر JUBILATE ہو سکتے ہیں۔ البتہ اگر ان سے مراد یونہی رسمی کاروائی کو نبھانا ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

بقول میرے ایک عزیز ساتھی کے ہم نظام الدین اولیاء کہنے کے عادی ہیں خواہ یہ ایک ہی ولی کیوں نہ ہوں۔ بہرحال یہ ایک ضمنی بات تھی ہمارا اصل موضوع تحریکِ پاکستان اور اس کے حقیقی مقاصد ہیں۔

گہر ہائے تابدار

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ——— رسول اللہ نے فرمایا کہ خبردار فتنہ واقع ہوگا۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اس سے کیونکر نجات ہوگی! آپؐ نے فرمایا کہ کتاب اللہ (پر عمل کرنے) سے جس میں تمہارے درمیان (حرام و حلال یا طاعت و گناہ وغیرہ کا) حکم ہے اور حق و باطل کے اندر قولِ فیصل ہے۔ جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا، ہلاک کرے گا اس کو اللہ جس نے قرآن کی طرف لوگوں کو بلایا۔ اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی۔ دارمی)

رسول اللہ نے فرمایا کہ میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی۔ سو جب کوئی حدیث میری طرف بیان کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو، جو اس کے موافق ہو اسے قبول کر لو، جو اس کے خلاف ہو، اسے رد کر دو۔ (بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح صفحہ ۴۸۰)

رسول اللہ نے فرمایا کہ زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ ہی کے ہیں۔ اس لئے زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے۔ (کتاب الاموال)

رسول اللہ نے فرمایا ——— ہمارا کوئی وارث نہیں۔ جو چھوڑا ہے وہ عام مسلمانوں کیلئے ہے (بخاری)

محترم قمر پرویز صاحب کا مقالہ جو قلتِ وقت کی وجہ سے سیمینار میں پڑھا نہ جاسکا۔

تحریکِ پاکستان کے مقاصد

عزیزانِ گرامی قدر! السلام وعلیکم۔

- خدا نے آدم کو بھی ایک حکم دیا اور ابلیس کو بھی۔
- آدم سے بھی اس حکم کی خلاف ورزی ہوئی اور ابلیس سے بھی

آدم نے پوچھنے پر جواب دیا:

"اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر زیادتی کرلی ہے۔ ۲۳/۷ ہم سے غلطی ہوئی ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم نادم ہیں۔ شرمسار ہیں۔"

یعنی آدم نے اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرالیا۔ اس طرح اس کے لئے اصلاحِ خویش اور بازآفرینی کے امکانات روشن ہوگئے۔ اس طرح اس سے کہا گیا کہ کوئی بات نہیں۔

"ہم تمہاری طرف راہنمائی بھیجتے رہیں گے۔ تم میں سے جو بھی اس کا اتباع کرے گا وہ خوف و حزن سے مامون رہے گا۔"

اسی کو فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کا امکان کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس:

ابلیس نے جواب دیا:

"تو نے مجھے گمراہ کیا ہے! (۱۶/۷، ۱۵/۳۹)

ابلیس کے معنی ہی مایوس کے ہیں جو اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے وہ اپنی حالت میں تبدیلی کیسے کرسکتا ہے۔ یہی اس کی ابدی مایوسی کی دلیل ہے۔

ہم مجبور نہیں ہیں حق ہمارے پاس ہے۔ پھر یہ مایوسی کیسی؟ یہ مجبوری کیونکر؟ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں حق و باطل کا ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ ٹکراؤ کمیونزم کے فلسفۂ تاریخ کا ٹکراؤ نہیں، جس میں کبھی ایک نظام غالب آجاتا ہے اور کبھی اس کے برعکس دوسرا نظام۔ حق و باطل کے ٹکراؤ میں حق آہستہ آہستہ باطل پر غالب آجاتا ہے۔ اگر کوئی ایسی جماعت وجود میں آجاتی ہے جو حق کی علمبردار بن کر رزمگاہِ حیات

میں باطل کے مقابل کھڑی ہو جاتی ہے تو حق کا غلبہ دلوں کے اندر ہو جاتا ہے لیکن اسی طرح حق کے غالب آنے کی رفتار بہت کمزور اور سُست ہوتی ہے۔ اگر انسان وحی کا اتباع نہیں کرتا تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی ایک راستہ اختیار کرتا ہے، کچھ دُور چلنے کے بعد اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ راستہ غلط ہے۔ پھر وہ دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس طرح وہ عقل کے تجرباتی طریق سے مختلف راستوں کی ٹھوکریں کھاتا ایک عرصہ دراز کے بعد صحیح منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

حاضرینِ کرام! ہمیں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ہی عقل اور تنہا عقل کے بل بوتے پر یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم نے کیا غلطی کی ہے جو آج ہم بھٹک رہے ہیں۔

آیئے ہم سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ قرآنی معیارِ قومیت کیا ہے۔ قرآن کہیں بھی عرب قوم یا ایران کی قوم، روم کی قوم یا یونان کی قوم کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ ذکر کرتا ہے تو قوم المجرمین اور قوم الغاسقین کا — قوم الظالمین اور قوم الکاذبین کا۔ جب وہ قوم المجرمین کہتا ہے، تو اس سے مُراد یہ ہوتی ہے کہ مجرم، خواہ وہ دنیا کے کسی مُلک میں بستے ہوں اور کسی خاندان نسل یا قبیلہ سے تعلق رکھتے ہوں، وہ سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ انہی جزئیات کو اس نے ایک عالمگیر کلیہ کے اندر سمو کر رکھ دیا۔ جب کہا کہ دنیا کے تمام وہ لوگ جو مستقل اقدارِ انسانیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہوں ایک قوم کے افراد ہیں اور تمام ایسے لوگ جو اس اصول سے انکار کریں دوسری قوم کے افراد۔ اس طرح اصل میں دو باتیں سامنے آگئیں، ایک ایمان اور دوسرے انکار۔ اس طرح انسانوں کے دو گروہ قائم ہو گئے۔ ایک ماننے والے اور دوسرے انکار کرنے والے۔ اس طرح ایک مومن کہلائے اور دوسرے کافر۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے مسلم اور غیر مسلم قومیت کا نظریہ، جو دین میں اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبالؒ نے اسی نظریہ کو اجاگر کیا اور اسی کو لے کر قائداعظمؒ تحریکِ پاکستان کے لیے میدان میں نکلے۔ ہمارے قائدؒ نے ۸۔ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر میں کہا:

"پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا"

یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

آپ دیکھیں کہ بات کس قدر واضح ہے کہ جب یہاں پہلی بار ایک غیر مسلم، اسلام لے آیا تو اس مُلک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آگیا۔ اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔

ہمیں غیروں سے تو گلہ نہیں، شکوہ ہے تو انہوں سے اور خاص طور پر ان لوگوں سے جن کے ہاتھ میں اقتدار رہا ہے اور ہے۔ انہوں نے دو قومی نظریہ سے ہمیشہ انحراف برتا ہے۔

پاکستان میں اس وقت تک تین آئین بن چکے ہیں۔ ان میں سے کسی آئین میں بھی پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو الگ قوم قرار نہیں دیا گیا۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قولتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔

اس مملکت میں عبادت نام ہوتا ہے قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مراد ہوتا ہے انسانوں کے خود ساختہ احکام و قوانین کی اطاعت۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے، ایک ایسے معاشرے کا قیام جس میں تمام افرادِ معاشرہ ان قوانین کا از خود اتباع کرتے جائیں۔

اسلام تخت و تاج سے وفاشعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا یعنی اس کے قوانین سے عہدِ وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس ضمن میں قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ:

"اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تکمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کیلئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

آپ نے دیکھا اور غور کیا کہ یہی تھی وہ بنیاد اور تخلیق و تشکیلِ پاکستان کی وجہِ جواز۔ ہم نے اُس وقت اپنے آپ سے اور اللہ تعالےٰ سے عہد کیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی مُلک ہوگا اور یہاں قرآن کا نظامِ حیات رائج کیا جائے گا۔ تاکہ یہ زندگی اور وہ زندگی بھی خوشگوار ہو سکے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپ حضورِ اکرمؐ کے پاس آیا تھا اور دعوتِ اسلام کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی تھی اور پوچھا تھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا تھا کہ جنّت، یعنی باغ و بہارِ آخرت۔ اس نے کہا کہ یہ تو لجد کی بات ہے۔ میں یہاں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔ (الکامل)

تحریکِ پاکستان کا بھی مطلب یہی تھا کہ ایک قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دی جائے تاکہ اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جو حرکتِ پیہم اور سعیِ مسلسل کا آئینہ دار ہو۔ وہ معاشرہ جس میں قرآنِ کریم کے غیر متبدّل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے ہوئے اور بڑھتے ہوئے

والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جائے۔ ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے ایک ایسا نظام قائم نہ کیا جو ذی حیات تحریک کی شکل اختیار کرتا۔ ہم نے اپنی زندگی میں، اپنے معاشرہ میں ایک جمود پیدا کر دیا ہے۔

یہاں پاکستان میں ہر آدمی کو روٹی کے چکر میں پھنسا کر رکھ دیا گیا ہے۔ یہاں حکومت نے آج تک یہ ذمہ داری قبول نہیں کی۔ اگر انسان کو روٹی کے چکر سے آزاد کر دیا جائے تو پھر وہ اپنی نگاہ سے تقدیریں بدل کر رکھ دیتا ہے۔

روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان کبھی انسانی سطح پر نہیں آسکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلے کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ قرآن نے اسی لئے حضرات انبیاء کرام سے کہا ہے کہ "اے ہمارے رسولو! طیّب رزق کھاؤ اور اعمالِ صالح کرو" (۲۳/۵۱)

اعمالِ صالح اور روٹی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی لئے کسی بزرگ سیانے نے یہ کہا ہے کہ اگر کسی کو یعنی انسان کو جنّت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں اُلجھا دو۔ خوف وحزن کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں۔ ویسے ہم نے تو پاکستان اس لئے بنایا تھا کہ یہاں خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ ہوگی۔ خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اُس نقصان اور تباہی کا احساس جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سُوئے کوفہ و بغداد

پاکستان اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصوّر کا حسین وجمیل پیکر بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن ہم نے ہر چیز کا، ہر قانون کا زبانی اقرار تو کیا اور کرتے ہیں۔ مگر عملاً اسے جھٹلاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

> اس قوم کی حالت بہت بُری ہو جاتی ہے جو عملاً ہمارے قانون کی تکذیب کرتی ہے۔ یہاں پر ظلم و زیادتی کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لُوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ یہ نہیں سوچتا کہ وہ اس طرح دوسرے کا نہیں اپنا نقصان کر رہا ہے۔ وہ سینے میں دِل تو رکھتے ہیں مگر ان سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں مگر انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ یہ انسان نہیں حیوان ہوتے ہیں۔

حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ لیکن انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے کیا تقاضے ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے زوال کی ابتدا کہاں سے اور کب شروع ہوئی۔ سب سے پہلے ہم نے یہاں دو قومی نظریہ کو بھلا دیا اور یہ نعرہ بلند کرنا شروع کر دیا کہ یہاں پاکستان میں بسنے والے سب ایک قوم ہیں یعنی سب پاکستانی ہیں۔ دوسری طرف ہم نے صوبائی تفریق پیدا کرنی شروع کر دی۔ پٹھان پنجابی، سندھی اور بلوچی کے امتیاز کی گرہیں مضبوط کر کے ایمان کے اشتراک کی بنا پر امتِ واحدہ کے تصور کو ملیامیٹ کر دیا۔ ہمارا دوسرا دعویٰ کہ ہم یہاں قوانینِ خداوندی نافذ کریں گے اسے اسلام کے اجارہ داروں نے عملاً ناممکن بنا دیا۔ ان لوگوں کا مطالبہ یہ ہے کہ یہاں قرآن و سنت کی بنیاد پر قانون بنے۔ مگر یہ قانون کیسے بنے اور کیسے بنتا۔ یہاں تو بہت سارے فرقے ہیں۔ جنکی اپنی اپنی فقہ ہے اور اپنے اپنے انداز میں سنت کی تعبیر کرتے ہیں۔ بنگالی، پٹھان، پنجابی، سندھی اور بلوچی کے امتیاز نے جداگانہ قومیتوں کے جراثیم کی پرورش کی اور علماء حضرات کے اس ناممکن العمل مطالبہ نے سیکولر حکومت کے تصور کو عام کیا۔ اس طرح پاکستانی مسلمانوں میں کوئی شئے وجہِ اشتراک نہ رہی۔ اس طرح مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہوگیا۔ اب یہاں بھی چار بلکہ پانچ قومیتوں کا نعرہ بلند کیا جا رہا ہے۔ ہمارا نعرہ بھی تو یہی تھا کہ ہم مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ اسی طرح ایک بنیاد پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔

صاحبِ صدر و معزز خواتین و حضرات!

قائدِ اعظمؒ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ اور ساتھ یہ بھی تھا کہ یہ ایک (THEOCRATIC STATE) نہیں ہوگی۔ یعنی اس کی حکومت کی باگ ڈور مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔

قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا:

"تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں، جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہنمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے وہ پیغام ہے اللہ تعالےٰ کی کتابِ عظیم قرآن پاک" (اپریل ۱۹۴۳ء)

پھر انہوں نے فرمایا:

"جب ہمارے پاس قرآنِ کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اسی کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے" (نومبر ۱۹۴۵ء)

عزیزانِ من! مایوسی کفر ہے یہ خطۂ پاک اب بھی بچ سکتا ہے اور ہم ایک قوم بن کر زندہ رہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کا علاج صرف اور صرف یہ ہے کہ جن بنیادوں پر اس مملکت کی عمارت استوار ہوئی تھی انہی بنیادوں

کو پھر سے قائم کرایا جائے۔ اس کا پہلا اور فوری علاج یہ ہے کہ آئین میں یہ شق رکھ دی جائے کہ پاکستان میں رہنے والے تمام مسلمان اسلام کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ یہاں پھر ایک سے زیادہ قوموں کا تصور رکھنا اور اس کی نشر و اشاعت کرنا مملکت کے خلاف بغاوت ہوگی۔ غیر مسلم اس قوم کے افراد نہیں قرار پا سکیں گے۔

دوسرے نمبر پر یہ کرنا ہوگا جس کے دُور رس نتائج برآمد ہوں گے یعنی مُلک کا نصابِ تعلیم پورے کا پورا بدلا جائے۔ ہر طالب علم اپنے دل و دماغ سے یہ تسلیم کرے کہ قرآنِ کریم انسانی زندگی کا واحد، مکمل غیر متبدّل اور آخری ضابطۂ حیات ہے۔ رنگ، نسل، خون، زبان اور وطن کی بنا پر تفریق یکسر خلافِ اسلام ہے اور وحدتِ امّت وحدتِ ضابطۂ حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں نہ مذہبی فرقے ہو سکتے ہیں نہ مختلف سیاسی پارٹیاں۔ قرآنِ کریم کو بنیاد تسلیم کر کے ایسا ضابطۂ قوانین مرتّب کیا جائے جو پاکستان کے تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ العمل ہو۔

اگر ایسا کر لیا گیا تو یہ خطۂ زمین نہ صرف باقی اور محفوظ رہ جائے گا بلکہ ایسا مستحکم ہو جائے گا کہ کوئی دشمن اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکے گا۔

یہ معاشی کمزوری۔ یہ اسلحہ کی کمی۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ چیزیں گو کہ بہت ضروری ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ مقدّم حیثیت قوم کی وحدت اور یکجہتی ہے۔

ہم نے ابھی تک سنگ و خشت کو کافی آزما لیا ہے۔ اب ایک موقعہ فکر و بصیرت کو بھی دیکر دیکھ لینا چاہیئے۔ قرآنِ کریم کا یہ بنیادی اصول اور قانون ہے کہ:

"جو بھی مصیبت آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوتی ہے" (۴۲/۳۰)

اس کی وجہ یا تو ہماری اپنی ذاتی غلطی ہوتی ہے یا اس کا ذمہ دار ہمارے معاشرہ کا غلط نظام ہوتا ہے۔

آیئے ہم سب قرآنِ کریم کی روشنی میں اپنی ذاتی غلطیاں دیکھیں اور اپنے معاشرہ کا نظام بدلنے کی کوشش کریں۔ ہمیں آدم ہونے کی حیثیت سے اپنی غلطی کو تسلیم کر لینا چاہیئے اور توبہ کرنے کے بعد یعنی جہاں سے ہمارا غلط قدم اٹھ گیا تھا وہاں سے پھر ایک مرتبہ صحیح سمت کی طرف صراطِ مستقیم کو اپناتے ہوئے چل پڑنا چاہیئے۔ یہ بندہ و آقا کی تمیز ختم کرنا ہوگی۔ انسانوں کے وضع کردہ نظامِ زندگی سے انکار کرنا ہوگا اور اس کی جگہ اللہ تعالےٰ کا مقرر کردہ نظامِ حیات کو نافذ کرنا ہوگا اور اپنانا ہوگا۔

یاد رکھئے کہ جو قانون کتاب اللہ کے مطابق ہوگا وہ مبنی بر عدل ہوگا اور جو اس کے خلاف ہوگا وہ ظُلم پر مبنی ہوگا۔ شکریہ!

عارفی سلطانہ

تحریکِ پاکستان

صاحبِ صدر اور عزیز ساتھیو! جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ قیامِ پاکستان کے سلسلے میں ہم قراردادِ پاکستان کی پچاسویں سالگرہ منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں برصغیر پاک و ہند کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی ہوگی۔ تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ وہ کیا حالات تھے۔ جن کی وجہ سے تحریکِ پاکستان کو پھولنے پھلنے کا موقعہ ملا۔

۱۹۴۰ء میں یعنی آج سے پچاس سال پہلے برصغیر کی آبادی تقریباً ۳۴ کروڑ تھی۔ اس کا رقبہ ۱۵ لاکھ ۷۰ ہزار مربع میل تھا۔ جس میں برطانوی ہند ۸ لاکھ ۲۰ ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا تھا۔ اس میں ۵۶۰ کے قریب ہندوستانی ریاستیں تھیں جن کا رقبہ ۷ لاکھ مربع میل تھا۔ اس آبادی کے سمندر میں مسلمانوں کی تعداد ۷ کروڑ ۷۰ لاکھ تھی۔ جبکہ ریاستوں کی آبادی ۸ کروڑ تھی۔

اگر برصغیر میں انگلستان جیسا پارلیمانی نظام نافذ کر دیا جاتا تو مسلمانوں کی حالت ایسی اقلیت میں تبدیل ہو جاتی جو کبھی بھی اکثریت میں نہ بدل سکتی تھی اس طرح وہ ہر حال میں ہندوؤں سے دبے رہتے۔ یہ صورت حال تھی جس نے مسلمانوں میں ایک طرح کی تشویش پیدا کر دی خاص کر جب گوکھلے وغیرہ لیڈروں کے ہاتھوں سے کانگرس کی باگ ڈور نکل کر مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں آئی۔ انہوں نے بیسویں صدی کے شروع میں ۱۹۱۴ء میں افریقہ سے آکر کانگرس کی باگ ڈور سنبھالی اور کانگرس کو ایک ہندو تنظیم کے طور پر مستحکم کرنا شروع کیا۔

گاندھی جی کا طریقۂ واردات بالکل انوکھا تھا۔ وہ اپنی شام کی دعاؤں میں بھگوت گیتا، قرآن، انجیل اور یہودیوں کی کتاب تک پڑھ ڈالتے تھے۔ لیکن ان کے آنے سے کانگرس نے خالصتاً ہندوؤں کا رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے انہیں مہان آتما کا خطاب دیا تھا۔ اور اسی سے انکا نام مہاتما گاندھی مشہور ہو گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی تمام آبادی ہندوستان کی آبادی ہے اور کانگرس ان کی نمائندہ جماعت ہے۔ مذہب ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے۔ لہٰذا اسے سیاست سے دور رکھنا چاہیئے۔

سیاست میں انگریزوں کا پارلیمانی نظام ہندوستان میں رائج ہونا چاہیئے۔ متحدہ قومیت آج کی زبان میں "ایکتا" ہندوستان کے گھمبیر مسائل ہیں۔ سب ہندوستانیوں کو چاہیئے کہ وہ انگریزوں کو ملک سے باہر نکال کر سوراج قائم کریں۔

ہم مسلمان ایک جذباتی قوم ہیں۔ اس لئے تنظیم کا فقدان ہمارا قومی نشان بن گیا ہے۔ اس وقت کے برصغیر میں بھی مسلمانوں کی یہی حالت تھی۔ ان کی تحریکیں بگولے کا سا رقص تھیں جو قوم کو کوئی ٹھوس فائدہ پہنچائے بغیر فضا میں دھول بکھیر دیتی تھیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے علامہ اقبالؒ کے کہنے پر قائداعظم محمد علی جناحؒ نے قوم کی قیادت سنبھالی اور کانگریس کے متحدہ قومیت کے دعوے کے علی الرغم یہ کہا کہ برصغیر میں ایک قوم نہیں دو قومیں بستی ہیں۔ جن کی تہذیب، ثقافت، مذہب، زبان ایک دوسرے سے الگ ہیں، یہ دو قومیں اکھٹی نہیں رہنا چاہتیں۔ لہٰذا جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس حصے کو علیحدہ کر کے انہیں دے دینا چاہیئے۔

تو ساتھیو! کانگریس کو چاہیئے تھا کہ وہ مسلمانوں کی اس تشویش کو سمجھتی کہ وہ سدا اقلیت نہیں رہنا چاہتے وہ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی اکثریت سے ڈرے ہوئے ہیں اور یہ مطالبہ کہ ہم کو علیحدہ ووٹ کا حق دو کس طرح ان کے اس جذبے کی ترجمانی کرتا ہے لیکن گاندھی، نہرو اور پٹیل جیسے لیڈروں نے مسلمانوں کے اس مطالبے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اور اس میں جو حقیقت چھپی ہوئی تھی اسے درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور اس مطالبے پر اڑے رہے کہ کانگریس ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم ہیں۔ انہوں نے اس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے مکاریوں اور سازشوں سے کام لینا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی ایک جماعت کو توڑ کر اسے رشوتیں دے کر اس کام پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانوں میں مسلم لیگ کے خلاف نفرت پھیلائے اور انہیں بتائے کہ قومیں مذہب سے نہیں اوطان سے تشکیل پاتی ہیں۔ پاکستان کا مطالبہ صرف فریب نظر ہے۔ مذہب پر انحصار کر کے الگ ملک بنانا اسلام کے منافی ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد ہندو باقی نہ رہیں گے تو فریضۂ تبلیغ کیسے انجام دیا جا سکے گا اور تبلیغ نہ ہو گی تو اسلام کا ایک عظیم رکن ڈھے جائیگا۔ اس طرح مطالبۂ پاکستان سے اسلام کی سربلندی کی بجائے اسے نقصان پہنچے گا۔

یہ مولانا حضرات ماسوا چند ایک کے پاکستان کے کتنے زبردست مخالف تھے۔ یہ بات آپ کو بنگال کی مثال سے سمجھ میں آجائے گی۔ تقسیم سے پہلے بنگال علماء کا گڑھ تھا۔ اور مشرقی بنگال پر تو ایک طرح سے مولویوں ہی کی حکومت قائم تھی۔ چونکہ وہاں کے عوام جاہل مطلق تھے اور چند توہم پرستانہ عقائد کو اسلام سمجھتے تھے۔ اس طرح کے جاہلانہ ماحول میں مولویوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور عوام کی زندگی کا کوئی مسئلہ

مولوی کی مرضی کے بغیر طے نہیں پا سکتا۔

۱۹۴۰ء میں جب مولوی فضل الحق نے لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں قراردادِ پاکستان پیش کی تو مولوی حضرات کو سخت بُرا لگا۔ چونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ اقتدار کی زمام ان کے ہاتھوں سے نکل کر مسٹروں کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ اس لڑائی میں جو حصولِ پاکستان کے لئے لڑی گئی، اس سے بنگال کے مسلم عوام بالکل بے خبر تھے۔ ہندوؤں اور انگریزوں نے اپنے خاص مصالح کے پیشِ نظر تعلیم کے دروازے ان پر بند کر رکھے تھے۔ اس لئے مشرقی بنگال کے عوام کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ ملک میں کس قسم کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ وہاں ہندوستان کے تقریباً ہر گوشے سے بڑا بڑا جغادری مولوی اور پیر ہر سال بنگال پہنچ جاتا اور تبلیغِ دین کے نام سے اپنی جھولیاں بھر کر واپس آیا کرتا تھا۔

جب مسلم لیگ نے الیکشن کا اعلان کیا اور مسلم لیگی لیڈروں نے مشرقی بنگال کا دَورہ کیا اور لوگوں پر پاکستان کی اہمیت واضح کرنی شروع کی تو ہندوؤں نے حسبِ عادت مولویوں کو ساتھ ملا کر سازشیں شروع کر دیں۔ مولوی صاحبان نے مسلم لیگی لیڈروں پر کفر کے فتوے لگائے اور پاکستان کی تحریک کو انگریزوں کا گٹھ جوڑ بتایا۔ مرکزی اسمبلی کے الیکشن کے بعد مسلم لیگ کے تمام کے تمام ممبر نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ ان کے حریفوں کی ضمانتیں بھی ضبط ہو گئیں۔ بنگال کی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ عوام نے مولویوں کی خواہش بلکہ حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہندوؤں نے مولویوں کو دھمکی دی کہ اب ہم تمہاری کسی طرح کی کوئی مدد کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ لوگ سخت گھبرائے۔ سب مولوی حضرات نے مقامی مولویوں کو ساتھ ملا کر ایک جلسہ کیا اور متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا کہ مسلم لیگ میں شامل ہونے والا، مسلم لیگ کو ووٹ دینے والا اور مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان کا ساتھ دینے والا فاسق، فاجر، کافر اور منافق ہے۔ اس کے ساتھ یہ اعلان بھی شامل ہے کہ مرکزی اسمبلی کے الیکشن میں جن لوگوں نے مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دیئے تھے وہ سب کے سب کافر ہیں اور دین سے خارج ہو چکے ہیں لہٰذا انکی بیویاں ان پر حرام ہو چکی ہیں۔ اگر وہ صدقِ دل سے توبہ کر کے دوبارہ مسلمان نہ ہو جائیں تو ایسے میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کرا دی جائے۔ مولویوں کے اس جلسے میں شرکت کرنے والوں کا بیان ہے کہ کئی آدمی جلسے ہی میں مولویوں کے دستِ حق پرست پر توبہ کر کے دوبارہ مسلمان ہوئے اور مولوی صاحب نے ان کی بیویوں سے دوبارہ ان کا نکاح پڑھایا۔

برصغیر کے مسلمان جس جدوجہد کے لئے اپنے آپ کو مستحکم کرنے میں لگے ہوئے تھے تاکہ وہ انگریز اور ہندوؤں کا مقابلہ کر سکیں یہ شیخ الحدیث، شیخ الہند، رئیس المفسرین اور امیرِ شریعت نیشنلسٹ علماء اس کو جڑ بنیاد سے ہلانے کے لئے اس طرح کے فتوے دینے میں مصروف تھے۔ ان کے برعکس قائدِ اعظمؒ

مسلمانوں کو اسلام کے جھنڈے تلے جمع کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ انکا خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک۔ لہٰذا وہ ایک قوم ہیں۔ ان کی نمائندہ کانگرس نہیں مسلم لیگ ہے۔ مسلم لیگ کو ان کی نمائندگی کا حق حاصل ہے۔ مسلمانوں کی نمائندہ صرف مسلمان جماعت مسلم لیگ ہو سکتی ہے کانگریس نہیں۔ کانگریس صرف برصغیر کے ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے۔

آزادی کی اس جدوجہد میں ہندو اپنی گذشتہ تہذیب کا احیاء کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ متحدہ قومیت کے نعرے کو سامنے رکھ کر پراچین تہذیب کو زندہ کیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے ہندی کی ترویج پر کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔ ایک مردہ زبان ہر طرف سنائی دینے لگی جس سے کان مانوس نہ تھے جب گاندھی جی سے پوچھا گیا کہ یہ زبان جسے آپ آج استعمال کروا رہے ہیں ہندوستان میں کہاں بولی جاتی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ زبان اگر اس وقت نہیں بولی جاتی تو آنے والے پچاس سالوں کے بعد ہر جگہ بولی جائے گی۔

گاندھی جی نے اپنی وضع قطع ہندو درویشوں کی سی بنائی ہوئی تھی۔ وہ اتنا مختصر لباس پہنتے تھے کہ چرچل نے انہیں فروری سنہ ۱۹۳۱ء میں "HALF NAKED FAKIR" "نیم برہنہ فقیر" کہا۔ مہاتما نے انہسا کا ترکش بھی پہن رکھا تھا جس میں ایک خوفناک تیر "برت" کا چھپائے ہوئے تھے۔ 'برت' جسے ہم روزہ کہتے ہیں۔ مرن برت میں بھی تبدیل ہونے کی دھمکی دیتا تھا۔ ایک بار گاندھی جی نے ۲۱ دن کا برت رکھنے کی دھمکی دی چرچل صاحب نے نئی دہلی کو لکھا:

"IF GANDHI WANTED TO STARVE HIMSELF TO DEATH HE WAS FREE TO GO AHEAD AND DO SO"

لیکن گاندھی جی بچ کر بمبئی میں اپنے ایک پرستار کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے اس اثناء میں چرچل نے تفتیش احوال کے لئے بمبئی میں ٹیلیگرام دے کر پوچھا:

"WHY HAD N'T GANDHI DIED YET ?"

"گاندھی صاحب ابھی تک مرے کیوں نہیں"

قائدِاعظمؒ کے لئے گاندھی جی کی سیاست کوئی بڑی بات نہ تھی۔ وہ ان کو جواب دینا خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی دشواریاں قال اللہ اور قال الرسول کہہ کر حملہ کرنے والے لوگ تھے۔ اس وقت محترم پرویز صاحب نے ان کا ساتھ دیا۔ طلوعِ اسلام رسالہ نکالا اور ان تمام لوگوں کو جو مذہب کا لبادہ اوڑھ کر تحریک کو ختم کرنا

...تے تھے۔ شافی جواب دیا جس وقت مارچ ۱۹۴۰ء کو قرار دادِ پاکستان پیش ہوئی۔ اس وقت بھی طلوعِ اسلام
...نڈل سب سے پہلے لگایا گیا۔ محترم پرویزؒ صاحب کو مولانا ابوالکلام آزادؔ جیسے لوگوں کا بھی سامنا کرنا
... جو اپنے وقت کے امام تصور کئے جاتے تھے۔ جن کا نام آتے ہی لوگ ان کے علم کی ہیبت سے کانپ
...تے تھے۔ سچ کی آواز کے سامنے جھوٹے نعرے لگانے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے، نہ کامیاب
...ئے اور آپ کا پاکستان جو ایک خواب تھا حقیقت بن گیا۔

تخلیقِ پاکستان کے کچھ ہی عرصے بعد قائدِاعظمؒ ہم میں نہ رہے۔ پاکستان بن چکا تھا۔ اب ان بنیادوں
...س پر اسے قائم کیا گیا تھا، مضبوط اور پائیدار بنانے کے لئے کام کرنا تھا، ان بنیادوں کو مستحکم کرنا تھا جن
...ہ پاکستان کی بقا کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ زیادہ نہیں صرف دو چیزوں کا ذکر میں آپ کے سامنے کروں گی۔

ہمارا پہلا دعوٰے یہ تھا کہ ہماری سیاست کی بنیاد دینِ اسلام ہے۔ ہمارا خدا ایک، کتاب ایک، قوم
...یک ہے۔ پاکستان صرف خطۂ ارض نہیں، یہ ایسا خطۂ ارض ہے جہاں مسجد تعمیر کی جانی ہے۔ ہمارا دعویٰ
تھا کہ ہم تمام دنیا کو دکھا دیں گے کہ ہمارے قرآن میں کیسا انسانیت ساز انقلاب موجود ہے جو انسانوں میں
...یسی تبدیلی لاسکتا ہے کہ وہ از خود انسانیت ساز کام کریں اور ان تمام تعصبات اور ناہمواریوں کو دور کردیں
جس نے انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بے انتہا متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور یہ گروہ باہم
جنگ و جدال میں مصروف رہ کر کرۂ ارض کے امن کو تہہ و بالا کر رہے ہیں۔ ساری دنیا متوقع نظروں سے
ہماری طرف دیکھ رہی تھی کہ ہم اسلام کے نام پر کیا کرتے ہیں۔ کیا تبدیلی لاتے ہیں کہ قائدِاعظمؒ کے انتقالِ
پُرملال کے بعد اسلام کے نام پر جو لوگ سامنے آئے وہ مُلّاں حضرات تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو تحریک
پاکستان کے سخت مخالف تھے لیکن نمعلوم کیوں پاکستان آگئے تھے۔ جب ان سے اسلام کے متعلق کہا
گیا تو وہ دوسری اور تیسری صدی کے قانون دان اشخاص کے فیصلے لے کر آگے بڑھے اور کہا کہ یہ اسلام
ہے اور اسے نافذ کیا جائے۔ اہلِ اقتدار نے بالکل بجا طور پر سوچا کہ یہ مقننوں کے فیصلے اس زمانے کے
ہیں۔ آج پندرھویں صدی میں دوسری یا تیسری صدی کے قانون دان اصحاب کے فیصلے کس طرح من وعن
نافذ ہوسکتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے انہوں نے اس کا برملا اظہار نہ کیا۔ اسلام کا نام اسی طرح چلتا رہا لیکن
اس کے وہ معنی جو قائدِاعظمؒ کی قیادت کے زمانے میں سامنے آئے تھے جس طرح سے اس نے مسلمانوں
کے اندر استحکام، ایک نصب العین کے لئے جدوجہد، یک جہتی کے جذبات پیدا کر دیئے تھے وہ سب
کچھ ندارد ہوگیا۔

قرآن کے اصول اس قابل ہیں کہ ان کو ہر زمانے میں لاگو کیا جاسکتا ہے مگر اس کی تشریحات اپنے

زمانے کی علمی سطح، سوسائٹی کے حالات کے مطابق ہوگی۔ ہر شخص کو قرآن کی راہنمائی میں سوچنے کا حق حاصل ہے۔ اشخاص کی طرح یہ حق قوموں کو بھی حاصل ہے اور اس پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ ہم مسلمانوں میں اتنی سکت تو نہ تھی کہ ہم ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہم نے سوچ بچار کو ختم کر کے اسلام کو صرف نعرے بازی کے لئے رکھ لیا اور کاروبارِ زندگی سیکولر طریقہ پر چلانے لگے۔

ہمارا دوسرا دعویٰ مسلمان قومیت کا تھا۔ اس کا ہم نے کیا حشر کیا اسے سندھ کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ عزیز ساتھیو! یہاں میں نے سندھ کی تاریخ قائدِاعظم کے وقت میں مختصر طور پر بیان کی ہے۔ یہ تاریخ ہماری نظروں سے چھپی ہوئی تھی۔ اس سے آپ کو علم ہوگا کہ یہ لوگ قائدِاعظمؒ کے زمانے میں کیا کرتے تھے۔ اور آج جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ تو بہت آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ہمارے آج کے پاکستان میں مسلمان قومیت کے خلاف سب سے زیادہ مؤثر نعرے سندھ میں لگائے جا رہے ہیں۔ جی ایم سید سندھ تحریک کے قائد جی۔ ایم سید ہیں۔ انہوں نے شروع میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی لیکن کس طرح ان کی ایک تصویر مولانا ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب "قائدِاعظم محمد علی جناح، جیسا میں انہیں جانتا ہوں" میں اس طرح کھینچی ہے:۔

> "سندھ میں مسلم لیگیوں کے دو گروہوں کے درمیان جن کے لیڈر وزیرِاعلیٰ سر غلام حسین ہدائت اللہ اور سندھ کی صوبائی مسلم لیگ کے صدر مسٹر جی۔ ایم سید تھے۔ تصادم کی خبریں آنا شروع ہوئیں۔ ہر ایک گروہ سندھ مسلم لیگ میں بالادستی حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھا۔ اطلاع ملی کہ جی۔ ایم سید ہدائت اللہ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ قائدِاعظمؒ نے ہدائت اللہ اور جی۔ ایم سید دونوں کو طلب کیا اور طویل بحث و تمحیص کے بعد ۷ جنوری ۱۹۴۵ء کو ایک بیان جاری کیا جس میں سر ہدائت اللہ کو لیگ کا لیڈر مقرر کیا گیا۔"

ہماری شومئی تقدیر سے جی۔ ایم سید ایسے نہ تھے کہ مسلم لیگ کے مفاد کی خاطر خاموش ہو جاتے انہوں نے اپنا جھگڑا جاری رکھا۔ پھر مسٹر جناح نے سید کو بمبئی بلایا اور ان سے تین دن کی گفت و شنید کے بعد دونوں فریقوں کے نام مفاہمت اور صوبائی مسلم لیگ میں وسیع تر تعاون کی اپیل جاری کی لیکن جھگڑا پھر بھی جاری رہا۔ الزامات اور جوابی الزامات کی بے تحاشا یوچھاڑ ہو رہی تھی۔ ۲۴ فروری ۱۹۴۵ء کو بجٹ کی ایک مد پر ــــ سر ہدائت اللہ کی وزارت کو ۱۹ کے مقابلے میں ۲۵ ووٹوں سے شکست ہوئی کیونکہ مسلم لیگ پارٹی کے سید گروپ نے وزارت کے خلاف ووٹ دیا تھا۔

سید صاحب خود بھی مسلم لیگی تھے اور سندھ صوبائی مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ اس کے باوجود اپنی پارٹی کو شکست دلوانے کی کارستانی کر رہے تھے۔ دوسری طرف سر ہدایت اللہ نے وزارت بنانے کی خاطر ایک غیر ممبر کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ جو پارٹی ڈسپلن کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تھی۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد سید نے ۲۷۔ فروری کو قائدِ اعظمؒ کو ایک تار دیا جس میں ان سے مشورے اور ہدایات کی درخواست کی گئی تھی۔ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے جی۔ ایم سید کو ۲۸۔ فروری کو یہ تار بھیجا:

"آپ کے چوبیس ۲۴ اور ستائیس ۲۷ فروری کے تار ملے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ آپ نے غیر آئینی طریقے اختیار کئے۔ اپنے آپ کو غیر شایانِ شان سازشوں میں مبتلا کیا۔ دشمنوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئے اور اپنے لیڈر اور اس پارٹی سے جس میں آپ شامل تھے دھوکا کیا۔ اس حرکت سے آپ نے ہمارے مفاد اور مسلم لیگ کے وقار کو نقصان پہنچایا ہے۔ آپ نے ایک بحرانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ پارٹی کے نظم و ضبط کو توڑا ہے۔ اور بمبئی کی گفت و شنید کے خاتمے پر آپ نے مجھے جو اطمینان دلایا تھا اس کے علی الرغم اور میرے مشورے کے برخلاف ایک افتراق پیدا کر کے سندھ کے مسلمانوں کے اتحاد و یکجہتی کو متزلزل کر دیا ہے۔ آپ نے کمیٹی آف ایکشن، مرکزی پارلیمنٹری بورڈ لیگ مشینری آئین اور قواعد و ضوابط سب کو نظر انداز کر کے جن سے اور جن کے ذریعہ آپ کسی بھی حقیقی بے الضافی کی دادرسی حاصل کر سکتے تھے۔ ان کی بجائے غلط طور پر ایسے طریقے اختیار کئے ہیں جن سے لیگی تنظیم کے بنیادی ڈھانچے اور اس کے اغراض و مقاصد کی بیخ کنی مقصود ہے۔ آپ کا یہ طریق کار نہایت نامناسب اور مسلمانوں اور مسلم لیگ کے مفادات کے لئے نقصان رساں ہے۔ لہٰذا آئندہ کوئی مشورہ یا ہدایات دینا بے سود ہے۔"

اس طرزِ عمل پر ہر طرف سے لے دے ہونے لگی تو ہدایت اللہ اور جی۔ ایم سید دونوں اپنے اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹ گئے۔ جی۔ ایم سید نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں کے نام ایک تار دیکر صلح کر لی۔

وزارتی گروپ اور سید گروپ میں ۱۹۴۶ء کو ہونے والے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدواروں کے نام پر پھر اختلاف رونما ہوا۔ صوبائی پارلیمنٹری بورڈ اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی

یا پالیمینٹری بورڈ نے مداخلت کی اور سندھ کی اسمبلی کے انتخابات لڑنے کے لئے لیگ کے امیدواروں کو منتخب کرنا شروع کیا لیکن سید اور ان کے گروپ نے جو ابھی تک مسلم لیگ میں شامل ہے، مرکزی پارلیمینٹری بورڈ کے فیصلوں کی پابندی نہیں کی بلکہ خود اپنے امیدوار کھڑے کر دیئے۔ اس طرح انہوں نے ضبط و نظم کی اعلانیہ خلاف ورزی کی اور اس کی پاداش میں کمیٹی آف ایکشن نے جس کی صدارت نواب محمد اسماعیل خاں کر رہے تھے انہیں مسلم لیگ سے خارج کر دیا۔ انجام کار مسلم لیگ نے ۲۸ نشستیں جیتیں اور دوسرے مسلمانوں نے صرف سات۔

سر ہدایت اللہ نے نو منتخب شدہ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے وزارت بنائی۔ اس وزارت کو محض ایک ووٹ کی مجموعی اکثریت حاصل تھی۔ سید اپنے تین پیروؤں سمیت اسمبلی کے ہندو ارکان کے ساتھ مل کر برابر وزارت کی بیخ کنی کے لئے کام کرتے رہے چونکہ ایک مسلم لیگی رکن نے لیگ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس لئے وزارتی پارٹی اور حزب مخالف کی تعداد برابر ہو گئی۔ ان حالات میں حکومت کا کام چلانا ممکن نہ رہا لہٰذا گورنر نے اسمبلی کو ختم کر دیا اور آئندہ عام انتخابات کے لئے جو دسمبر میں ہونے والے تھے، کے لئے ایک نگران حکومت بنا دی۔

یہ ہے جی ایم سید کا کردار لیکن افسوس تو یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی ان عناصر کو ملک میں پھولنے پھلنے کا موقع دیا گیا اور وہ ہر طرح کا زہریلا پروپیگنڈا کھلم کھلا کرتے رہے۔ کسی نے ان کو ٹوکا نہیں اور نہ ہی ان کی ملک دشمن سرگرمیوں کا نوٹس لیا گیا۔ یہاں تک کہ حال ہی میں پاکستان کا پرچم جلانے پر بھی چند گرما گرم بحثیں اسمبلی میں ضرور ہوئیں، پھر یہ سب کچھ طاقِ نسیاں کے حوالے کر دیا گیا۔

میرے ساتھیو! آج وقت وہ جا رہا ہے کہ فلسطین کا یہودی رُوس سے یہودیوں کو بلا کر یہ کہتا ہے کہ یہ ہمارے ہیں۔ یہ یہودی ہیں۔ ہم انہیں روسی ہونے کے باوجود اپنے مُلک میں بسائیں گے۔ جب کہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ مسلمان ہمارے نہیں ہیں۔ یہ بلوچی ہیں، یہ سندھی ہیں، یہ پٹھان ہیں۔ یہ پنجابی ہیں۔ اچھا! یہ سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد اور پنجاب اس طرح بنے بنائے آسمان سے خدا کی طرف سے تو نہیں اُترے۔ یہ تو انتظامی ضرورت کے لئے انگریز کی کھینچی ہوئی چند لکیریں ہیں۔

ہمارے سامنے تو دنیا، غیر مسلم دنیا یہ نقشہ پیش کر رہی ہے کہ جرمنی کے لوگ دیوار جرمنی توڑ کر آگے بڑھ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم ایک قوم ہیں دو قومیں نہیں ہیں اور ہم مسلمان ہو کر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم چار قومیں ہیں ایک قوم نہیں ہیں۔ قرآن ہمارے پاس ہے۔ قرآن کے اصولوں میں آج بھی وہی زندگی ہے جو پہلے تھی۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ زندگی کے راہنما اصول کبھی نہیں بدلتے۔ ہم کو چاہیئے کہ ہم قرآن کی زندگی بخش روشنی سے راہنمائی حاصل کریں اور اس طرح اس قابل ہو جائیں کہ اقدارِ خداوندی کا بول بالا کر سکیں

غلام رسول ازہر

تحریکِ پاکستان

مارچ کا بہار آفریں مہینہ نئے برگ و بار لانے اور پوشش کہنہ اتارنے کا مہینہ ہے۔ خوشبو، رنگ اور لطافت کا حسین امتزاج لئے نیرنگیٔ لیل و نہار کے تغیر آفریں تناظر میں یہ مہینہ رُتوں کا سردار ہے اور ایسے ہی شہر لاہور برِعظیم ہند و پاک کے وسیع العریض بلاد ہائے کہنہ کے پس منظر میں تہذیب و ثقافت سے مرصع و مزین روشنیوں کا شہر اور جانفزاء عروس البلاد ہے۔

لاریب یہ سعادتِ عظمیٰ مارچ اور لاہور کے حصے میں آئی کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اسلامیانِ ہند نے اپنی منزلِ مقصود کا تعین کیا اور بابائے قوم حضرت قائدِاعظمؒ کی زندگی بخش، دل نواز اور رُوح پرور، بے مثال قیادت میں قرار دادِ پاکستان کی تاریخی اور یادگار دستاویز آزادی پر مہرِ تصدیق و توثیق ثبت کر کے مکمل آزادی کا مطالبہ بطور ملی اور قومی نصب العین اپنایا اور یوں لاہور کے ماضی کے منٹو پارک اور حال کے اقبال پارک میں، جہاں اب بنائے پاکستان فلک الافلاک کی رفعتیں لئے ہوئے، اسلامیانِ ہند و پاک کی امنگوں اور ان کے محبوب قائدِاعظمؒ کے جذبۂ حریت اور عزم بالجزم کی منفرد اور ممتاز تاریخی علامت بن کر پایۂ استقلال پر ایستادہ ہے۔ برِعظیم ہند و پاک کے جیالے مسلمانوں نے اپنے لئے ایک الگ خطۂ زمین بطور وطن، نعروں اور تالیوں کی گونج میں خدائے بزرگ و برتر سے ایک درویش صفت غازی سلطان کی تعمیر کردہ پادشاہی مسجد کے زیرِ سایہ اور ایک بلند اقبال فقیرِ خدامست کے مرقدِ پُر انوار کے نوریں ہالے میں دست بدعا ہو کر مانگا جس نے بتائید ایزدی حضرتِ قائدِاعظمؒ ایسے بطلِ جلیل کی، بطور راہنمائے اسلامیانِ ہند اور میرِ کاروانِ آزادی، بروقت نشاندہی کی تھی:

رنگِ بلند، سخنِ دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

۱۹۴۰ء کے مارچ کا یہ موسم بہار بھی بے حد غیر معمولی تھا کہ بیک وقت گُل رنگ بھی تھا اور لہو رنگ بھی۔ اس کے اوراقِ چمن پر نہ صرف جابجا خوش نظر اور خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے بلکہ ۱۹ مارچ کی

خون کی ہولی کے سبب جا بجا نوجوان خاکسار شہداء اور مجروحین کے تازہ اور گرم خون کے چھینٹے دھبے اور داغ بھی داغہائے سینہ کی طرح نمایاں تھے۔ ایسے ہی مسیحا نفس قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کا وردِ مسعود اہلِ لاہور کے زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کے مترادف تھا۔

حضرت قائدِ اعظمؒ ۲۱۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور پہنچے اور پھر انہوں نے لاہور پہنچتے ہی اپنی اوّلین مصروفیت کے طور پر زخمی خاکساروں کی میو ہسپتال لاہور میں بنفسِ نفیس عیادت کی اور یوں لاہور کی ماتم کناں بوجھل اور افسردہ فضا کی تلخی اور افسردگی کو بہت حد تک کم کر دیا۔ اگلے روز یعنی ۲۱۔ مارچ کی شام کو پرچم لہرانے کی مختصر سی رسم میں بھی اس جلیل القدر مردِ مخلص نے بے ساختہ مضطرب الحال ہو کر یہ جملے ارشاد فرمائے:

"میں ابھی ابھی میو ہسپتال سے اپنے جگر کے ٹکڑوں، اپنے زخمی بیٹوں کو دیکھ کر آ رہا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری مصیبت کس درجہ قیامت خیز ہے لیکن جذبات کے تلاطم میں نہ بہہ جاؤ۔ مردانہ وار مقابلہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ مظلوم کی پوری پوری داد رسی ہوگی۔ حق و انصاف کا بول بالا ہوگا۔"

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۴۰ء صـ۸)

اس سانحہ کی مزید صدائے بازگشت اگلے روز یوں سنائی دی:۔

"۲۲۔ مارچ ۱۹۴۰ء بعد دوپہر کے کھلے اجلاس میں کم از کم پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ نواب سر شاہ نواز خاں صاحب، صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ یہ خطبہ حسبِ دستور پہلے سے چھاپ رکھا تھا۔ لیکن قدرت کا تماشا دیکھئے کہ کسی کو یاد نہ رہا کہ اس میں سے وہ حصّہ خارج کر دیا جائے جو خوامخواہ سرودِ بہ مستان یاد دہانی بن جائے گا۔ پڑھتے پڑھتے حکومتِ پنجاب کے "درخشندہ کارناموں" کا ذکر آیا تو ۱۹۔ مارچ کے حادثۂ محزنہ کی یاد نے لوگوں کے دلوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور پنڈال نفرین و لعنت کے تہلکہ انگیز نعروں سے گونج اٹھا۔ مسلمانانِ لاہور نے تین دن سے جن جگر گداز جذبات کو اپنے سینوں میں دبائے رکھا تھا۔ آج وہ پوری آزادی کے ساتھ باہر آ گئے۔"

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۴۰ء صـ۸)

خاکساروں کا یہ سانحۂ خونیں اس قدر دلدوز، کربناک اور دلخراش اہمیت کا حامل تھا کہ اس ضمن میں مسلم لیگ کے اجلاس میں ۲۴۔ مارچ کو بھی ایک باقاعدہ ریزولیوشن پاس کیا گیا جسے تمام اخبار و جرائد میں نمایاں جگہ دی گئی۔ اس پر طلوعِ اسلام کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے!

"اور بالآخر ۲۴۔ کی شب آخری اجلاس میں جبکہ پنڈال میں کم از کم ایک لاکھ کا مجمع ہوگا۔

مجمع کیا جوش و جذبات کا بحرِ متموج تھا۔ جو ہر متصادم عنصر کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانے کے لئے کف بر دہان موجزن تھا۔ ایسے وقت میں خاکساروں کے حادثۂ فاجعہ کے متعلق ریزولیوشن پیش کرنا اس صاحبِ ہمت، مردِ دانا کا کام تھا جسے اللہ نے پیرانہ سالی میں وہ جرأت و حوصلہ دیا ہے جو نوجوانوں کو بھی شرما دے۔ صاحبِ صدر نے اس ریزولیوشن کو پیش کیا اور ایک لاکھ کے مجمع میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جس نے اس کی مخالفت میں ایک آواز بھی اٹھائی ہو۔ صاحبِ صدر نے پوچھا کہ کیا یہ چاہتے ہو کہ اس پر کھلے اجلاس میں بحث و تمحیص ہو لیکن سب نے کہہ دیا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں، اس سے اندازہ فرمایئے کہ مسلمانوں کو اپنے اس ملی راہنما پر کس قدر اعتماد ہے۔ وَ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤتِیہِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ"

(طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۴۰ء صنا)

اس قرارداد کی تسوید کے ضمن میں ایک لطیف واقعہ بھی ہوا جو جناب احمد سعید کرمانی صاحب کی زبانی کچھ یوں ہے:

"۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو خاکساروں کے بارے میں جو قرارداد پیش کرنا مقصود تھی۔ اس ضمن میں حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح نے مولانا ظفر علی خاں سے اسکا ترجمہ کرنے کو کہا۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خاں نے اس مسودہ کا ترجمہ کیا جس پر قائدِ اعظمؒ نے فرمایا۔ "ZAFAR ALI KHAN, PUT SENSE IN TO IT"

اور پھر آپ نے ملک برکت علی صاحب ایڈووکیٹ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"MALIK BARKAT ALI WILL DO IT"

چنانچہ ملک برکت علی صاحب نے جب اس کا ترجمہ کیا تو مولانا ظفر علی خاں نے معًا قائدِ اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔ "MR JINNAH, I ASK HIM TO PUT HEART IN TO IT" ۔

چنانچہ اس موقع پر دو بڑوں کی نوک جھونک نے نہ صرف خوب لطف دیا بلکہ قرارداد کی صحیح طور پر تسوید کے بارے میں حقیقتِ نفس الامری کی رُودکشائی بھی کر دی۔

آمدن بر سر مطلب تاریخی قراردادِ لاہور مؤرخہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو شیرِ بنگال مولوی ابوالقاسم وزیرِ اعلیٰ بنگال نے پیش کی تھی جس کی تائید علی الخصوص اقلیت کے صوبوں کے مسلمان نمائندوں نے بڑھ چڑھ کر کی تھی۔ اور یوں اسلامیانِ برصغیر ہندو پاکستان نے حضرت قائدِ اعظمؒ کی قیادت میں تاسیسِ پاکستان کا وہ پہلا بنیادی پتھر

رکھا جس کی عملی علامت موجودہ مینارِ پاکستان اور عملی تعبیر قیامِ مملکتِ خداداد پاکستان ہے جو ایک عظیم اسلامی مملکت ہونے کے ناتے سے بیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ ہے اور ہمارے قائدِ اعظمؒ کی مومنانہ بصیرت کا شاہکار ہے۔

اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ

مومن کی فراست سے خبردار رہو کہ وہ اللہ کے نور سے (ماہیتِ اشیاء کو) دیکھتا اور پرکھتا ہے

میری یہ عین خوش نصیبی ہے کہ میں مارچ ۱۹۴۰ء میں ضلع جالندھر سے لاہور میں بطور ایک نوخیز نووارد طالبِ علم آیا تھا۔ میری شعوری عمر اس قابل نہ تھی کہ میں اس عظیم الشان قومی اجتماع میں کیے گئے فیصلوں کو اسی پس منظر میں اور اسی اہمیت سے جانچ سکتا جن کے وہ مقتضی تھے۔ تاہم لاہور کی اداس ملگجی فضا اب بھی رُوح کو بوجھل کیے ہوئے ہے کہ بے گناہ خاکساروں کے خاک و خون میں ملنے کے مناظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ابھر آتے ہیں۔ حکومتِ پنجاب کا غیض و غضب پوری قہرمانیوں کے ساتھ اُن پر نازل ہو چکا تھا ان کو چُن چُن کر مارا اور گرفتار کیا جاتا تھا بہت سے خاکسار شہر کی مساجد میں پناہ ڈھونڈتے ہوئے تھے۔ جہاں انگریزی استبداد کے عفریت ان پر بدستور سایہ فگن تھے۔ اور یوں زندہ دلانِ لاہور کے دل اس ظلم و ستم اور جور و استبداد پر خون کے آنسو رو رہے تھے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ ستائیسواں سالانہ اجلاس تھا اور لاہور میں پہلا اجلاس تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ حضرت قائدِ اعظمؒ سے کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ کے اجلاس کے لئے لاہور کی خونرنگ اور اداس فضا سازگار نہیں مگر قائدِ اعظمؒ نہ مانے اور وہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی سے بذریعہ ٹرین لاہور پہنچے اور یہ اجلاس تین روز یعنی ۲۲، ۲۳ اور ۲۴ مارچ کو نظام الاوقات کے مطابق لاہور کے وسیع و عریض منٹو پارک میں منعقد ہُوا۔ سہ روزہ کاروائی کی تفاصیل یادوں کے دھندلکوں میں کھو چکی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کے قومی دن کے حوالہ سے مستند شواہد کی روشنی میں یادوں کے جھروکوں کو کھولا جائے تاکہ ہم لطفِ 'بازدید' سے محظوظ ہو سکیں۔

انور علی قریشی غازی آبادی میرے بعد کے استادِ مکرم پروفیسر ڈاکٹر برکت علی قریشی پرنسپل اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے، برادرِ نسبتی تھے۔ اور ان دنوں مسلم لیگ کے شاعر کی حیثیت سے بہت ہر دلعزیز اور مشہور تھے۔ میں نے انہیں ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۶ء، مسلم لیگ کے بیشتر جلسوں میں بڑی دلسوزی کے ساتھ اپنے لحن داؤدی میں قومی نظمیں پڑھتے دیکھا اور سنا ہے۔ وہ بھی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے اس تاریخی اجلاس میں بطور 'قومی شاعر' موجود تھے اور انہوں نے حضرت قائدِ اعظمؒ کی موجودگی میں میاں بشیر احمد مرحوم

کی نظم "ملّت کا پاسباں ہے محمد علی جناح" بہت پُر تاثیر لہجے میں سنائی تھی۔ اس لئے اب ہم انہیں کی یادوں کی روشنی میں ۲۳ مارچ کے تاریخی اجلاس کی یادوں کے احیاء کا آغاز کرتے ہیں:۔

"لاہور کے تاریخی اجلاس سے تقریباً تین روز پہلے میں یہاں (لاہور) پہنچا اور اپنے بہنوئی پروفیسر بی اے قریشی پرنسپل اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، کے ہاں ٹھہرا۔ پھر تیار ہو کر میاں لبشیر احمد سیکرٹری استقبالیہ کی کوٹھی "المنظر"، لارنس روڈ پہنچا۔ تعارف کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔ میاں صاحب نے بتایا کہ اس اجلاس کے لئے میں نے ایک نظم لکھی ہے۔ اور چاہتا ہوں کہ اسے کوئی ترنم کے ساتھ پڑھے ان کی قیام گاہ پر مقامی شعراء بھی موجود تھے سب نے طبع آزمائی کی مگر میاں صاحب نے اپنی نظم کو پڑھنے کیلئے مجھے منتخب کیا اور کئی بار ریہرسل کروائی۔ نظم حسب ذیل تھی:۔

ملّت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملّت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناح
صد شکر پھر ہے گرمِ سفر اپنا کارواں
اور میرِ کارواں ہے محمد علی جناح
تقدیرِ عزم، جانِ وفا، رُوحِ حرّیت!
ہے کون؟ بے گماں ہے محمد علی جناح
رکھتا ہے دل میں تاب و تواں لو کروڑ کی
کہنے کو ناتواں ہے محمد علی جناح
رگ رگ میں اس کی ولولہ ہے حُبِّ قوم کا
پیری میں بھی جواں ہے محمد علی جناح
لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح
غیروں کے دل بھی سینوں کے اندر دہل گئے
مظلوم کی فغاں ہے محمد علی جناح
اے قوم اپنے قائدِ اعظم کی قدر کر
اسلام کا نشاں ہے محمد علی جناح

لاہور اپنے بخت پہ نازاں ہے کیوں نہ ہو ——— آج اپنا میہماں ہے محمد علی جناح

جلسہ گاہ کا سماں بھی عجیب تھا جو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ڈھائی لاکھ فرزندانِ ملت موجود تھے جو بار بار "قائدِ اعظم زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ حضرت قائدِ اعظمؒ کرسیٔ صدارت پر تشریف فرما تھے۔ جلسے کی کارروائی کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ پھر اعلان کیا گیا کہ ہمارے قومی شاعر (اس وقت مجھے قومی شاعر کہا جاتا تھا) جناب انور غازی آبادی میاں بشیر احمد کی نظم پیش کریں گے۔ میں اٹھا۔ ڈائس پر آیا اور نظم پڑھنی شروع کی۔ ہر شعر محمد علی جناح پر ختم ہوتا اور میں قائدِ اعظمؒ کی طرف دیکھتا۔ جب بھی میری نظر پڑی یہی دیکھا کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اس دوران میں انہوں نے ایک بار خواجہ ناظم الدین اور ایک بار قائدِ ملت خان لیاقت علی خاں سے کچھ کہا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ نظم تو اپنی جگہ ہے لیکن پڑھنے کے انداز نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ سامعین پر ایک سکتے کا عالم طاری تھا اور ہر شعر کے بعد نعرۂ تکبیر بلند ہوتا تھا۔ میں نظم پڑھ کر بیٹھ گیا۔ ایک آدمی نے دبی زبان سے ابوالاثر حفیظ جالندھری سے کہا ایک قافیہ چھوٹ گیا ہے یعنی "دھواں"، جناب حفیظ جالندھری نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر دبی زبان سے بولے:

ہر سُو لگی ہے سینۂ مسلم میں ایک آگ
اس آگ کا دھواں ہے محمد علی جناح

نظم کے بعد شیرِ بنگال مولوی فضل الحق نے قرارداد پیش کی جو منظور کر لی گئی اور پھر اس کی تائید کا سلسلہ شروع ہوا اور تقریریں ہوئیں۔ صوبہ یو۔پی کی نمائندگی کرتے ہوئے چوہدری خلیق الزماں نے تائید کرتے ہوئے بڑی جذباتی تقریر کی۔ اس کے بعد آئی آئی چندریگر (بمبئی) سیّد عبدالرؤف (سی۔پی) سردار اورنگ زیب خاں (سرحد) مولانا ظفر علی خان (پنجاب) سیٹھ عبداللہ ہارون (سندھ) اور نواب یار جنگ بہادر (دکن) نے تائید کرتے ہوئے مختصر تقریریں کیں۔

جب قرارداد متفقہ طور پر منظور ہو گئی تو قائدِ اعظم نے اپنے صدارتی خطبے میں یہ تاریخی الفاظ کہے:

"آج شاعرِ مشرق ہمارے درمیان نہیں ہیں اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ دیکھ کر خوش ہوتے کہ ہم وہی کر رہے ہیں جو وہ چاہتے تھے۔"[1]

---

[1] بحوالہ "میرے قائد کی باتیں"، انور علی قریشی غازی آبادی، ص ۸۱ اقراء قائدِ اعظم نمبر۔ گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور

نواب یار جنگ بہادر بے مثل خطیب، پکے اور سچے عاشق رسولؐ اور حضرت قائداعظمؒ کے فدائی تھے۔ وہ بھی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو شریک تھے اور اس کے بعد بھی وہ دیگر اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے۔ ان کے بے مثل بلیغانہ انداز میں اپنے قائدؒ کا تذکرہ سنئے!

"کوئی قوم ذہنی انقلاب کے بغیر عملی انقلاب کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ انگریز کی عطا کی ہوئی اس جمہوریت سے بغاوت اور ایک مستقل قوم ہونے کے دعوے نے مسلمان کی فکر کے زاویئے درست کر دیئے اور اب وقت آگیا تھا کہ ایک منزلِ مقصود اس کے سامنے رکھی جائے سیرت النبیؐ کی اصطلاحوں میں اگر گفتگو کی جائے تو بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں ایک مکّی دَور سے گذر رہا تھا اور اس کے لئے ایک ایسے مدینہ کی ضرورت تھی جہاں اپنے قدم جما کر وہ بدر و احد کی تیاری کر سکے اور خدائے قدیر سے "سلطان نصیر" کا امیدوار ہو سکے۔ محمد علی جناح نے آغوشِ مغرب میں پرورش پائی تھی۔ ان کے دماغ کا ایک ایک گوشہ فکرِ مغرب کا مرہونِ منت تھا۔ اور ان کے جسم کی ایک ایک پور مغرب کی آئینہ دار تھی لیکن ان کا نام محمدؐ اور علیؓ سے نسبت رکھتا تھا۔ اس لئے ان کا دل فکرِ محمدؐ اور عزمِ علیؓ کے پرتَو سے خالی نہ تھا۔ اعتباری اور اصطلاحی حیثیت سے چاہے انہوں نے تعلیماتِ محمدیؐ کا کوئی درس نہ لیا ہو لیکن ان کے قلب کی گہرائیاں روحِ تعلیماتِ محمدیؐ سے محروم نہ تھیں۔ وہ غیر شعوری یا نیم شعوری طور پر اسی طرف گئے، جدھر ایک اصطلاحی عالمِ دین شعوری طور پر جا سکتا اور اعلان کیا کہ ہر قوم اپنے لئے ایک مستقر چاہتی ہے۔ اور اپنی تہذیب و تمدن کو اس وقت تک ترقی نہیں دے سکتی جب تک کہ وہ کسی جگہ اپنے اختیارات کو کامل طور پر استعمال کرنے کے قابل نہ ہو۔ اس لئے مسلمان ان علاقوں میں جہاں ان کی عددی اکثریت ہے اپنی ایک آزاد سلطنت چاہتے ہیں یہی بنیاد ہے شمال مغربی اور شمال مشرقی گوشوں میں آزاد اسلامی حکومت کے مطالبہ کی۔ جس کو ہندوؤں نے پاکستان کہا اور پھر انہی کو سمجھانے کے لئے انہی کی اصطلاح میں مسلمان بھی پاکستان کہنے لگے۔"

(اقراء۔ قائداعظم نمبر۔ گورنمنٹ ایم۔ اے او کالج لاہور۔ ص ۱۸-۱۹)

پروفیسر محمد اسحٰق قریشی اپنے بیش بہا مقالے، بعنوان "۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء۔ قراردادِ پاکستان" مطبوعہ نوائے وقت

طباعت اور پیکیجنگ کی جملہ ضروریات کیلئے النور پرنٹرز و پبلیشرز
۲/۴ فیصل نگر ملتان روڈ لاہور۔
فون ۲۷۵۸۲۶

مؤرخہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۹ء میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے اس مبارک تاریخی اجلاس کا آنکھوں دیکھا حال یوں بیان فرماتے ہیں:

"اس پُرشکوہ تاریخی اجلاس کی کچھ یادیں ان عظیم المرتبت شخصیات سے تعلق رکھتی ہیں، جنہیں سُننے دیکھنے اور ملنے کا موقع مجھے زندگی میں پہلی بار اس جلسہ گاہ میں ملا تھا۔ وہ راہنما جن کی فکرِ فراست جہدِ مسلسل اور قربانیوں سے پاکستان کا قیام ممکن ہوا۔ کچھ یادیں ان واقعات سے متعلق ہیں جن سے اس اجلاس کی شان اور رفعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور کچھ یادیں وہ ہیں جن کا تعلق میرے جذبات اور وثوق سے ہے۔ ان یادگار واقعات کی تفصیل اخبار کے مختصر کالموں میں سمونا ممکن نہیں۔ اس لئے صرف میں ان باتوں کے اظہار پر اکتفا کروں گا۔ جو قرار دادِ پاکستان کے پس منظر مقاصد اور مقاصد کے حصول کی جدّوجہد کے صحیح ادراک کے لئے ضروری ہیں اس لئے ان مقاصد کے شعور کے بغیر ہم تکمیل اور استحکامِ پاکستان کی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ہمارا موجودہ ذہنی خلفشار، علاقائی تعصّبات، گروہی کشاکش، معاشی عدم مساوات اسی بے خبری کا نتیجہ ہیں۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس تھا، جو ۲۲، ۲۳ اور ۲۴ تاریخ کو لاہور کے وسیع منٹو پارک میں منعقد ہوا، جہاں آج کل مینارِ پاکستان تعمیر کیا گیا ہے۔ اجلاس میں شرکت کے لئے ملک کے طول و عرض سے متعدد زعماء اور مندوبین دو دن پہلے لاہور میں پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ قائدِاعظم کی لاہور میں آمد سے دو دن پہلے لاہور میں ایک وحشت ناک خونی حادثہ ہو گیا۔ خاکساروں کے ایک احتجاجی جلوس پر پولیس نے گولی چلا کر بربریت کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجہ میں چالیس خاکسار شہید ہو گئے۔ خاکساروں کے بے دردانہ قتل سے پُررونق لاہور پر غم اور افسردگی کی فضا چھا گئی۔ اس ماحول میں یہ اطلاع پھیل گئی کہ پنجاب کے وزیراعظم سر سکندر حیات نے قائدِاعظم کو درخواست کی ہے کہ وہ اجلاس کو ملتوی کر دیں۔ اس روز یہ بھی مشہور ہوا تھا کہ یہ ساری سازش برطانوی حکمرانوں کی تھی اس لئے عوام میں سر سکندر کے خلاف شدید غم و غصہ تھا جس کو لوگ اس جانکاہ سانحہ کا ذمہ دار گردانتے تھے۔ قائدِاعظم نے جو ۲۱ مارچ کو لاہور پہنچے۔ اپنے استقبال کے تمام انتظام ختم کرنے کا حکم دیا۔ نیشنل گارڈ کی سلامی لینے اور ہار پہننے سے بھی انکار کر دیا۔ اور ممدوٹ والا پہنچ کر صحافیوں کو بتایا کہ لیگ کا اجلاس مقررہ پروگرام کے مطابق ہوگا۔ اس اعلان کے بعد، انہوں نے سب سے پہلے ہسپتال جا کر خاکسار زخمیوں کی عیادت کی۔ اسی شام

جلسہ گاہ میں پرچم کشائی کی رسم ادا کرنے کے بعد قائدِ اعظم نے اپنے مختصر خطاب میں اس سانحہ کو افسوسناک کہا اور زخمیوں کے لئے اظہارِ ہمدردی کیا۔ قائدِ اعظم کے اس مدبرانہ اظہارِ افسوس اور احساسِ غم نے فضا کی افسردگی اور تلخی کو کم کر دیا اور سہ روزہ اجلاس انتہائی نظم و نسق کے ساتھ پُروقار انداز میں انجام پذیر ہُوا۔ اسی شام پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں مفکرِ اسلام علامہ اقبالؒ کی یاد میں ایک جلسہ ہُوا جس کی صدارت حیدر آباد کے جناب نواب بہادر یار جنگ نے کی۔ اس اجلاس میں علامہ اقبال کی مشہور نظم "نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے" بڑے سوز اور ترنم کے ساتھ پڑھی گئی۔ اس تمثیل سے حاضرین بہت خوش ہوئے کیونکہ کسی نہ کسی صورت میں وزیرِ اعظم پنجاب سکندر حیات کی مذمت کے خواہشمند تھے۔ اس اجلاس کی سب سے زیادہ قابلِ ذکر بات وہ خراجِ عقیدت تھا جو شعلہ نوا مقرر نواب بہادر یار جنگ نے شاعرِ مشرق اور مفکرِ اسلام علامہ اقبال کو پیش کیا ....

بہادر یار جنگ نے خطابت کے فن کا جو مظاہرہ کیا، معلوم ہوتا تھا کہ اس جادو سے سامعین سب سو گئے ہیں اور صرف اقبال کی رُوح اس حال میں متحرک ہے اور جاگ رہی ہے......

ریاست کشمیر سے ہم چار دوست آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کے اجلاس میں بحیثیت مندوب شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں سٹیٹس مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا رکن تھا۔ شیخ عبدالرحمٰن ایم۔ اے حفیظ اور پیر صاحب جموں کشمیر مسلم لیگ کے عہدیدار تھے۔ لاہور پہنچ کر مجھے شیخ عطاء اللہ سجاد، پروفیسر حمید احمد خاں اور چوہدری یعقوب علی خاں مل گئے۔ یوں ہم جلسہ کی کاروائی کھانے پینے اور سیر و سیاحت کے پروگرام میں اکھٹے شریک ہوتے تھے۔ چوہدری یعقوب علی خاں اس وقت جالندھر مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، شیخ عطاء اللہ سجاد اور پروفیسر حمید احمد خاں علی الترتیب ہائی کورٹ کے جج اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔

(اجلاس کی سہ روزہ کاروائی کی تفاصیل بڑی دراز ہیں۔ نواب ممدوٹ کا خطبۂ استقبالیہ، میاں بشیر احمد کی مشہور نظم "ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح"

دکھتا ہے دل میں تاب و تواں تو کروڑ کی

کہنے کو ناتواں ہے محمد علی جناح

قائدِ اعظم کی غیر روائتی ان لکھی تقریر، تھوڑی اردو میں اور زیادہ انگریزی میں۔

بنگال کے وزیرِاعظم شیرِبنگال مولوی فضل حق کا تائیدی خطاب ۔ یہ سب کچھ تاریخ کی کتابوں میں حروفِ زر سے لکھنے کے قابل ہے لیکن اس نمائندہ عظیم الشان اجتماع کی اصل روئیداد وہ قراردادِ پاکستان ہے جو اسلامیانِ ہند کی صد سالہ جدّوجہد کا فکری اور نظریاتی نچوڑ اور ماحصل ہے "۔

لذیذ بود حکائت دراز تر گفتم کے مصداق یہ داستان بہت طویل مگر دلپذیر ہے۔ الحمدللہ ہمارے پاس شواہد وافر ہیں۔ لیجئے ! اب آپ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی زبان میں اس تاریخی اجتماع کی اثر انگیزی کا مختصر حال سنئے !! ۱ء

" مارچ ۱۹۴۰ء کی ایک صبح کو لاہور کے کالج میں کچھ نوجوان لیکچرار موجود تھے اور اس معجزے پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے جیسے گذشتہ شب انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے رونما ہوتے دیکھا تھا۔ وہ معجزہ یہ تھا کہ جو بات ایک دن پہلے تک محض خواب و خیال معلوم ہوتی تھی وہی اب ایک حقیقت بن کر مسلمانانِ برّعظیم کے دل و دماغ کو منوّر کر رہی تھی اِس انقلاب کا سبب صرف اتنا تھا کہ رات آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں مسلمانوں کے پیرانہ سال مگر جواں ہمّت قائد محمّد علی جناح نے مسلسل چند گھنٹوں تک ایک معرکۃ الآراء تقریر کر کے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اس برّعظیم کے مسلمان ایک قوم ہیں، ایک ایسی قوم جو اپنا ایک مسلک رکھتی ہے اور ساتھ ہی یہ عزم کہ وہ اپنے اس ملک میں آزاد ہو کر رہے گی ۔ ان لفظوں میں کچھ ایسا اعجاز تھا کہ کل جو لوگ ہراساں تھے کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔ آج ان کے دل خود بخود گواہی دے رہے تھے کہ یہ ہو کر رہے گا "

مسٹر محمد شفیع (م۔ش) کے حوالہ سے کچھ مزید یادیں سمیٹ کر اب ہم حضرت قائدِاعظمؒ کی اس تاریخی تقریر کے کچھ حصّے دُہرا کر ان کی یاد اپنے سینوں میں محفوظ کر کے ان کی رُوحِ پُرفتوح پر صدہا سلام کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

" ۲۱ ، مارچ ۱۹۴۰ء کی صبح جب جھنڈیوں سے آراستہ خصوصی ٹرین جس میں ہندوستان بھر کے مسلم لیگی راہنما قراردادِ لاہور (قراردادِ پاکستان) کا تاریخی فیصلہ کرنے پنجاب کے دارالحکومت آ رہے تھے ، لاہور ریلوے اسٹیشن کے خصوصی پلیٹ فارم پر آکر رُکی اور فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے قائدِاعظم اپنی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کی معیّت میں باہر آئے تو پنجاب کے وزیرِاعلیٰ

۱ء اقراء ۔ قائدِاعظم نمبر۔ گورنمنٹ ۔ ایم ۔ اے ۔ او کالج لاہور (ص ۸۷)

سر سکندر حیات خاں جو ان کا انتظار کر رہے تھے۔ مسلم لیگ کے راہنما کے گلے میں ہار ڈالنے کے لئے آگے بڑھے۔ اس پر قائدِاعظم نے درشتی سے فرمایا۔ نہیں میں کسی ایسی سرزمین پر اپنے گلے میں پھولوں کے ہار پہننا پسند نہیں کرتا۔ جہاں صرف دو روز پہلے بے گناہ اور معصوم مسلمانوں کا خون بہایا گیا ہو۔

جب قائدِاعظم لوگوں سے مصافحہ کرنے کے لئے آگے بڑھے تو اس وقت بھی ان کے چہرے سے خفگی اور ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ان کا خیر مقدم کرنے والوں میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر نواب سر محمد شاہنواز آف ممدوٹ۔ پنجاب کی کابینہ کے مسلمان ارکان، صوبہ سرحد کے سردار اورنگ زیب خاں، (پنجاب) کے نواب مظفر خاں اور میاں امیر الدین شامل تھے۔

یہ پتہ چلا کہ نئی دہلی سے لاہور تک رات بھر سفر کے دوران میں تمام اہم ریلوے سٹیشنوں پر مسلم عوام لاہور میں خاکساروں پر فائرنگ کے خلاف مظاہرے کرتے رہے اور پنجاب کی وزارت کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کرتے رہے۔ امرتسر ریلوے اسٹیشن پر احراریوں کے ایک زبردست مجمع نے قائدِاعظم کو مجبور کیا کہ وہ ڈبے سے باہر نکل کر ان سے خطاب کریں۔ مظاہرین پنجاب کے وزیرِاعلیٰ کو سزائے موت دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر پنجاب کے وزیرِاعلیٰ کے ساتھ قائدِاعظم کا رُوکھا برتاؤ صرف انہیں یہ جتلانے کیلئے تھا کہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو جو کچھ ہُوا اس پر وہ کس قدر ناراض ہیں۔ جب قائدِاعظم ریلوے اسٹیشن سے باہر کھلی فضا میں تشریف لائے تو اداس اور برہم عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہُوا سمندر جو میلا رام تالاب تک پھیلا ہُوا تھا، زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے ان کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ قائدِاعظم کو ایک بڑے جلوس کی شکل میں ریلوے اسٹیشن سے نہایت سلیقے سے آراستہ بازاروں یعنی لنڈا بازار کشمیری بازار اور ٹیکسالی بازار کے راستے منٹو پارک لے جانے کا انتظام کیا گیا۔ منٹو پارک میں مسلم لیگ کے اجلاس کے لئے ایک وسیع و عریض پنڈال تعمیر کیا گیا تھا۔ لیکن قائدِاعظم نے یہ کہتے ہوئے جلوس میں جانے سے بڑی سختی سے انکار کر دیا کہ جب یہاں کی مغموم فضا میں شہداء کا خون رچا ہے تو میں بھلا جلوس میں کیسے شامل ہو سکتا ہوں۔

قائدِاعظم کی لاہور تشریف آوری سے دو روز قبل یعنی ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو یہاں خاکساروں کا پولیس سے تصادم ہُوا تھا اور کئی خاکسار شہید اور متعدد زخمی ہوئے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کے سلسلے میں ایسی عمنک تمہید کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شہر میں ہر قسم کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں کہ کیا مسلم لیگ کا اجلاس پروگرام کے مطابق منعقد ہو گا؟ کیا یہ اجلاس کسی اور تاریخ کو کسی اور جگہ

کیا جائے گا؟ پنجاب مسلم لیگ لاہور اور دہلی میں مسلم ہائی کمانڈ کے لیڈروں کے مابین بڑی عجلت میں ٹیلیفون پر بات چیت شروع ہوگئی۔ مگر جب قائدِاعظم نے اجلاس کو ملتوی کرنے کی تجویز سختی سے مسترد کردی تو پھر قطعی طور پر طے ہوگیا۔

قائدِاعظم جب ریلوے اسٹیشن سے ممدوٹ ولا جا رہے تھے تو وہ رپورٹروں سے ملتے وقت عزم و سکون کی مجسم تصویر نظر آرہے تھے۔ ٹریبون کے مسٹر اے سی بالی نے اپنے تمام پیشہ ورانہ داؤ پیچ استعمال کئے کہ کسی نہ کسی طرح خاکساروں اور پولیس کے تصادم پر قائدِاعظم کی رائے کا اظہار کروا سکے۔ لیکن قائدِاعظم نے کہا کہ وہ دونوں طرف سے حالات معلوم کئے بغیر اور خود تفتیش کئے بغیر اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ ہر چند کہ انہیں اشتعال دلانے کی کوشش کی گئی لیکن قائدِاعظم پھر بھی پُرسکون رہے۔ قائدِاعظم نے محض اتنا کہا کہ مسلم لیگ کا اجلاس ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔

زخمی خاکساروں کی عیادت

قائدِاعظم رپورٹروں کو غصّے اور جھنجھلاہٹ کی حالت میں چھوڑ کر آرام کرنے چلے گئے۔ پھر میاں امیرالدین اور سردار اورنگ زیب ممدوٹ ولا آئے اور انہوں نے قائدِاعظم کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ انہیں ان خاکساروں کی عیادت کے لئے جو پولیس کے ساتھ تصادم میں زخمی ہوئے ہیں میو ہسپتال جانا چاہیئے۔ اس پر انہوں نے بڑی خوشی سے اتفاق کیا۔ اور چند ہی منٹ بعد ان کی کار میو ہسپتال کی طرف روال تھی۔ قائدِاعظم نے ہسپتال کے مختلف وارڈوں کا دورہ کیا۔ جہاں زخمی خاکسار زیرِ علاج تھے۔ انہوں نے ان سے نہایت ہمدردانہ اور محبت بھرے لہجے میں گفتگو کی۔ خاکسار قائدِاعظم کی اس مشفقانہ عیادت سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ اب تک جو فضا غیر یقینی اور پریشان کن تھی۔ وفعتہً خوشگوار نظر آنے لگی وہ لوگ جو یہ سوچ کر پریشان تھے کہ اگر فضا اسی طرح مکدر رہی تو مسلم لیگ کے اجلاس میں فساد کا خطرہ ہے۔ قائدِاعظم کے اس اقدام سے بہت پُرامید ہوگئے۔ مسٹر کے ایل۔ گابا۔ باجی رشید لطیف اور میاں عبدالعزیز ایم۔ ایل۔ اے اور چند دوسرے لوگ جو مسلم لیگ کے اجلاس میں رخنہ ڈالنے کی تیاریاں کر رہے تھے خود آکر قائدِاعظم سے ملے اور انہوں نے قائد کو اپنی پوری پوری امداد اور تعاون کا یقین دلایا۔

میو ہسپتال سے قائد سیدھے منٹو پارک (موجودہ اقبال پارک) گئے جہاں انہوں نے ایک بڑے ہجوم کی موجودگی میں پرچم کشائی کی رسم ادا کی انہوں نے اپنی مختصر سی تقریر کی ابتداء یہ کہہ کر کی:

"میں ابھی ابھی اپنے بچوں، اپنی قوم کے جوانوں کی عیادت کے لئے میو ہسپتال گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے وہ روبصحت ہیں۔"

یہ اعلان سنتے ہی فضا "اللہ اکبر" اور "زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھی اور شک و شبہ کا دھندلکا مارچ کی روشن کرنوں کے سورج میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔

پرچم کشائی کی تقریب ختم کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں نہایت ہی خراب فضا میں ہو رہا ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک عظیم قوم اور ایک عظیم عوام کے لئے آزمائش کیا ہوتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ جتنی جتنی مشکلات بڑھتی جائیں ویسے ویسے ہماری قوتِ برداشت میں اضافہ ہوتے رہنا چاہیئے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک میں بے مثال ہجوم تھا۔ مسلم لیگی مندوبین اور نمائندے علامہ اقبال کی آخری آرام گاہ سے بمشکل نصف میل کے فاصلے پر عظیم الشان بادشاہی مسجد کے فلک بوس میناروں کے زیرِ سایہ قائدِ اعظم کی ولولہ انگیز اور مسحور کن تقریر سن رہے تھے۔ قائدِ اعظم سفید چوڑی دار پاجامہ اور سیاہ اچکن میں ملبوس تھے۔ یک چشمی عینک ان کی گردن میں حمائل تھی۔ آپ نے سامعین سے دو گھنٹے سے زیادہ دیر تک اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں خطاب کیا۔

قائدِ اعظم کی اس تقریر کے متن کی تفصیلات درج کرنے کا یہ محل نہیں۔ تاہم یہ واضح تھا کہ قائدِ اعظم اس وقت ملتِ اسلامیہ کے علیحدہ اور جداگانہ تشخص سے نہ خود مسلمانوں کو قائل کرنا چاہتے تھے بلکہ اس عہد کی سیاسی کشمکش کے دو بڑے حریفوں یعنی ہندوؤں اور انگریزوں پر بھی واضح کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ثقافتی اور سماجی اختلافات پر روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا:۔

> "ایک ہزار سال تک اکٹھے رہنے کے باوجود ہندو اور مسلمان قومیں آج بھی اتنی مختلف ہیں جتنی کہ پہلے دن تھیں۔ یہ امر خلافِ توقع ہے ان دونوں قوموں کو کبھی بھی محض جمہوری آئین کے ذریعے ایک قوم میں تبدیل کیا جا سکے گا۔ ہندو اور مسلمان نہ صرف دو مختلف مذاہب کے ماننے والے ہیں بلکہ سماجی اور ثقافتی طور پر بھی الگ الگ ہیں۔ ان کا ادب ان کی روایات، ان کے رہن سہن سب میں بعد المشرقین ہے۔ نہ ان کا آپس میں شادی بیاہ ہو سکتا ہے نہ یہ دونوں ایک جگہ بیٹھ کر کھا پی سکتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف تہذیبوں اور مختلف تمدنوں کا نام ہے اور ان دونوں قوموں کی بنیاد متضاد نظریات اور خیالات پر ہے۔"

قائدِ اعظم نے جذباتی انداز میں اعلان کیا:

> اگر برطانوی حکومت خلوص اور سنجیدگی سے برصغیر کے عوام کی خوشحالی اور امن کی

خواہاں ہے تو ہم سب کا واحد مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ برصغیر کو خود مختار ریاستوں میں
تقسیم کر کے بڑی قوموں کے لئے جُدا وطن بنا دیئے جائیں۔"

قائدِ اعظم کی اس ولولہ انگیز تقریر نے آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے لئے راستہ ہموار کر دیا کہ وہ اس قرار داد کا مسوّدہ تیار کرے جو قرار دادِ لاہور اور بعد میں قرار دادِ پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی۔

۲۴ مارچ کو قائدِ اعظم کی ناگزیر عدم موجودگی کے سبب استقبالیہ کمیٹی کے صدر نواب سر محمد شاہنواز خاں ممدوٹ نے صدارت کی۔ اس روز جن لوگوں نے 'قرار دادِ لاہور' کی حمائت کی ان میں سے محمد اسمٰعیل خان (بہار) قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان) مسٹر آئی۔ آئی چندریگر (بمبئی) سید عبدالرؤف (سی۔پی) اور ڈاکٹر محمد عالم (پنجاب) قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر عالم نے کانگریس سے استعفیٰ دے کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس کے بعد کھانے کے لئے مجلس ملتوی ہوگئی۔

شام کا اجلاس ۸ بجے قائدِ اعظم کی صدارت میں شروع ہوا۔

بالآخر ۱۴ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو نعمتِ عظمیٰ کی شکل میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت بفضلِ ایزدی ظہور پذیر ہوئی اور یوں فرمودۂ قائدِ اعظم بہ توفیقِ خداوندی "مملکتِ خداداد پاکستان" کی صورت میں دنیا کے نقشے پر اُبھر کر پورا ہو گیا۔ اہلِ پاکستان حضرت قائدِ اعظم کے شکر گزار ہیں جن کی بے مثل قیادت، مومنانہ بصیرت عمل پیہم، یقین محکم، عزم بالجزم، جہدِ مسلسل اور شب و روز کی محنتِ شاقہ سے یہ معجزہ برپا ہوا اور حق تعالیٰ نے ان کی بے لوث مساعیٔ حسنہ کو قبول فرما کر ہمیں ایک عظیم ملک عطا فرمایا جہاں ہم قوانینِ خداوندی کی روشنی میں بہترین راہ پر گامزن ہو کر اقوامِ عالم میں قابلِ تقلید نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔ قائدِ اعظم کی یاد منانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم ان اقدارِ حیات پر صدقِ دل سے عمل پیرا ہوں۔ جو حضرت قائدِ اعظم کو محبوب تھیں۔

قائدِ اعظمؒ بے لاگ۔ بے غرض۔ بے لوث اور ناقابلِ خرید تھے۔ وہ آہنی عزم کے پکے اور اپنے عزمِ صمیم میں مثالی تھے۔ انہوں نے "اتحاد۔ ایمان اور تنظیم" کے نعرۂ مستانہ پر عمل پیرا ہو کر ہمیشہ قومی مقتضیات اور مصالح کو پیشِ نظر رکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک آزاد اور خود مختار مملکت غیر مسلموں اور انگریزوں کی لامحدود قوت کے علی الرغم حاصل کی۔ اگر وہ بھی ہمارے عام ناعاقبت اندیش کوتاہ نظر اور مطلب کوش گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے اور ذاتی منفعت۔ مکر و فریب۔ دھوکہ دہی۔ تن پروری۔ خویش پروری۔ بے راہروی فضول خرچی۔ دھاندلی اور مسخرہ پن کو شعارِ زندگی بناتے اور یوں زندگی کی پست اقدار کے عفریتِ سیاہ فام کی پیروی کرتے تو لاریب آزادی کا یہ خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا اور ہم ابلقِ لیل و نہار پر خرمستیاں کرتے ہوئے ابھی تک دشتِ ظلمت میں منزلِ مراد سے کالے کوسوں دُور خراب و خستہ حال، درماندہ و

گم کردۂ منزل راہرو کی طرح آوارہ و سرگرداں خاک چھانتے نظر آتے۔

لازم ہے کہ ہم فرموداتِ اقبالؒ اور ان کے لائقِ اعتماد راہنما حضرت قائدِاعظمؒ کے نقشِ قدم پر چلیں اور حضرت قائدِاعظمؒ کے انمول ورثے کی نہ صرف پوری تندہی اور دلجمعی سے حفاظت کریں بلکہ اس کے ادھورے خاکے میں از سرِ نو مزید رنگ بھر کر عظیم تر پاکستان کی صورت میں عملِ پیہم کی "کھلی اسم سم" سے تکمیل کی منزل تک پہنچائیں۔

ہندوستان میں لاکھوں کی تعداد میں لٹی عصمتوں والی مائیں شاید اب بھی ہماری اعانت کی منتظر ہوں۔ وہاں کے کروڑوں مسلمان شاید اب بھی ہمیں اپنا مسیحا جان کر:

کہ آجائے کوئی راہوارِ وحشت پہ سوار اب بھی

ہمارے منتظر ہوں۔ وادیٔ کشمیر کے خاک و خون میں نہائے ہوئے محبِ وطن جیالے اب بھی ہماری راہ تک رہے ہیں کہ کب ان کی اور ہماری شہ رگ پنجۂ ہنود سے آزاد ہو۔ مشرقی پاکستان کے بھائی اب بھی ہمارے بھائی ہیں اور رشتۂ مودت و اخوت میں حسبِ سابق پروئے جانے کی آس لگائے بیٹھے ہیں کہ:

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

الغرض پاکستان سب کے لئے پناہ گاہ اور لاریب اسلام کا قلعہ ہے اور سب اسلامیانِ عالم کے لئے مرکزِ امید اور اخلاقی اور مادی قوت کا حصار ہے۔ پس لازم ہے کہ ہم حضرت قائدِاعظمؒ کی طرح ترجیحات متعین کر کے غائتِ پاکستان کی منزلِ مراد تک پہنچیں اور حضرت قائدِاعظمؒ کے خوابوں کو عملی تعبیر کا جامہ پہنائیں۔ نہ تنگ نظری کے ہلاکت خیز تعصبات کا جامہ اوڑھ کر اور پنجابی، سندھی، پختون اور بلوچی بن کر اپنے لئے ہمہ وقت رسوائی، جگ ہنسائی، تشتت و افتراق، ضعف اور تخریب کا سامانِ موت آہنگ بہم پہنچائیں۔

افسوس، صد افسوس۔ اب ہمارے محبوب قائدِاعظم ہم میں نہیں۔ وگرنہ جو کچھ اب ہو رہا ہے۔ ایسا کبھی نہ ہوتا:

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

صدمہ

لاہور بزم کے رکن اور اعزازی لائبریرین محترم محمد رفیق صاحب کی والدہ ماجدہ وفات پاگئیں!
وابستگانِ تحریک ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دست بدعا ہیں۔
اللہ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے!

By thus relegating the Quran to the Mullah, whom Muhammad Tughlaq, who lived much before his time, described their existence as " Unfair to the people and fatal to the State," we have lost the battle by default. The Quran was meant to be studied by physical and social scientists and not left at the mercy of those who consider joy and laughter as haram; who have sadistic pleasure in throwing every one, particularly women, into hell-fire, and to whom reason and intellect are blasphemy and Kufar. If we had followed the intellectual path of Sir Syed Ahmed Khan , Iqbal and Parwez in approaching the Quran, today after fifty years of passing of the "Lahore Resolution" and forty two years after independence, we would have had something to show to the world as an alternative to capitalism and socialism as Iqbal had dreamed. Today we would have been strong enough to protect and emancipate humanity which include both Muslims and Non-Muslims as the victims of apartheid and untouchability; victims of neo-imperialism and socialistic totalitarianism; victims of male chauvinism ; victims of poverty and disease; victims of illiteracy and ignorance. On the contrary we ourselves have become victims of all these ills and the butt of international ridicule and a beggar's basket.

The grand dream of Iqbal can still become true, it is never too late. Only we need individuals, even a few of them, whose hearts according to an Urdu proverb do not have a chore (thief) in them; at whom no finger can point; who cannot be bought and who like Muhammad (PBUH) can present their own person, their integrity as a vindication of the truth they wish to test as an example for others. Jinnah was such a one. He was a human being and so was Muhammad (PBUH) and so are we. We can do what they did. And as goes an anonymous saying ; " The best way to make your dreams come true is to wake up."

معذرت

بوجہ عدم گنجائش "نورِ مبین" ۔ "قرآن اور عورت" "قرآنی تعلیم بچوں کیلئے" اس ماہ شاملِ اشاعت نہیں ہو سکے ـــــ ادارہ معذرت خواہ ہے ـــــ سیمینار میں پڑھے جانے والے دوسرے مضامین آئندہ اشاعت میں دیکھئے گا! ـــــ ایڈیٹر

Religion." Religion is the medium through which the clergy functions, destroying rationality and arousing peoples emotions by saying according to Quran: Do not listen to the Nabi, he is corrupting their minds by encouraging them to deviate from the path of their forefathers. A very clever trick indeed. The Quran laments: what, even if they were on the wrong path ?

The fact is Ladies and Gentlemen, the clergy can flourish in a secular state, but they become obsolete and their existence meaningless in an Islamic State where, as the Quran expressed several times, it is the people who through democratic methods and techniques of the times will make decisions within the Islamic Signposts. These are the reasons behind Mullah´s opposition to the Pakistan Movement but that is a story by itself.

Today many developed societies have liberated themselves from the clerical clutches only to fall into the trap of the dualism of matter and spirit. I will not go into the sickness of the mind and heart that it leads to, that´s the field of the philosophers and the psychologists, but this dualism has in political life definitely led to realpolitik , a complete divorce of human values in our public life. We are all foxes and lions, deceivers, liars, murderers all, and yet each maligning the other most self-righteously, as Machiavellian. Each claims to have at best an "enlightened self-interest," or claims a "Principled Stand," oblivious of being sucked in by the quicksand of fraud and inhumanity. The dichotomy is that side by side with self righteousness, it is thrown on our faces that idealism in politics is stupid and impossible. The Quran on the other hand is at pains to emphasisethat idealism and human values alone behove a human being, or else he is relegated to sub-animal destruction and filth. Cavour the Italian Statesman frankly admitted that "If we did for ourselves what we do for our country, what rascals we should be."

The point I am trying to make is that an Islamic Society and State is neither theocratic nor secular. By immediately identifying theocracy with Islam, the intellectuals have done a colossal harm to Pakistan and to humanity at large.

emphasized " There are communalisms and communalism". Jinnah also asked his people not to be nervous by the taunt of communalism. So we see that the prospective Indian or any other nation- state had national interests at best; the vision of the "Lahore Resolution" was not just another nation- state, but a society whose justification for existence was safeguarding of human interests. Quran appeals to human kind, Al-Nas not to any particular group. There are no chosen people. It is the duty of an Islamic state to protect the life, property and houses of worship - temples, churches and synagogues. Iqbal was expressing this very attitude when he said in his 1930 Address. "It is my duty according to the teachings of the Quran even to defend their places of worship if need be " This is exactly what Quaid-e-Azam attempted to say in his speech to the constituent Assembly on August 11. Although rather hurriedly worded, he has assured the Quranic guarantees of every ones protection and freedom of worship. Day in and day out, this has been misread as " Secularism ". Those who gleefully conclude thus have to turn a few pages to read the Quaid's retort in the same Assembly on August 14 to a reference to emperor Akbar's toleration and goodwill that this was very recent history; actually this attitude dates back to Muhammad (peace be upon him) 1300 years ago. In in his talk to the Australian and American people he emphasized the working of democracy within Islamic Principles. Its significance is stupendous. In secularism, guarantees can be changed by a majority vote, in Islamic democracy, these guarantees of fundamental human freedom can never be changed. . Pakistan was to be a means to that end. Long before secularism overthrew the clergy and liberated human intellect, the Quran symbolically picked up Haman, the Pharaoh's high priest as the biggest threat to humanity. Secularism allows the clergy to function at the personal level, the Quran looks at it with horror as the medium of thought-control. No wonder Iqbal lashed out at the Mullahs the way he did, and Jinnah described them as an " undesirable element." After independence he repeatedly reminded his people and the world at large that Pakistan, as an Islamic State, could never be a theocracy. To day we are rightly concerned about theoratic revivalism, and we have been already badly bitten by it, but then Quran Itself is a safeguard against it. It was not for nothing that Parwez titled his book as " Islam A Challenge to

reproduce below a summary of it from my article" Iqbal as a Statesman" printed in " The Nation " in 1986. I quote:

> " In this cruel and unjust system, where a few capture power and monopolise the resources of the earth, where a few enjoy the bounties of nature through exploitation and enslavement of the many, there should be a group of people somewhere who could stay the hands of the tyrannical exploiters. Indeed there should be a group of people somewhere who could assure the homeless and insecure, irrespective of any consideration of race, colour, country or creed, that they will be given protection. Eventually he dreamed the Quranic dream of making the planet earth a homeland for the whole humankind as one human family. It was this dream that made him reject social, lingual, and geographical barriers as suicidal for humanity." I unquote.

Once again it is interesting to note that M.H.Saiyid while referring to Iqbal's 1930 Address emphasizes Iqbal's regret that the National idea was racialising the outlook of Muslims and thus materially counter acting the humanizing work of Islam. He also quotes Iqbal saying " For Islam (A Muslim State he visualized was) an opportunity to rid itself of the stamp that Arabian Imperialism was forced to give it." Similarly Shamloo talks of Iqbal's objective as establishing an "Ideal Society". Writing in 1944 and 1945 they knew what they were struggling for. Today we don't.

Indeed, the Quranic challenge is that the test for survival of any society and system is as to whether it functions for itself alone or for humanity as a whole. Survival is for those who live for humanity. That is why Iqbal regretted in his 1930 Address that "the upshot of the intellectual movement initiated by such men as Rousseau and Luther was the break up of the one into mutually ill-adjusted many, the transformation of a human into a national outlook....." Further more he says we " conceal our egoism under the cloak of a nationalism, outwardly stimulating a large hearted patriotism, but inwardly as narrow minded as a caste or a tribe ". Hence he

never bothered to claim and whom Muslims learned to appreciate when he was already gone never to return, was keeping Jinnah advised how an independent Muslim was thinking and should have thought." Later on he adds : " Iqbal was in continuous private correspondence with the league leader and was influencing his views which were becoming more and more confirmed in the light of his experience and observations." In addition to these remarks we should remain grateful to M.H.Saiyid for recording a very important quote rom the Quaid after the passing of Lahore Resolution. The quotation is " Iqbal is no more amongst us but had he been alive he would have been happy to know that we did exactly what he wanted us to do." Above all, the biggest proof, if proof were still needed, is the importance the Quaid gave to the letters of Iqbal written to him during this period. In his foreword he describes these letters as of very great historical importance which explain his views in clear and unambiguous terms on the political future of Muslim India. Regarding Iqbal as " the sage philosopher and national poet of Islam", the Quaid emphasizes that in the great achievement of the Muslim League " Sir Muhammad Iqbal played a very conspicuous part, though at the time not revealed to the public, in bringing about this consummation".

My grouse against historians of the Pakistan Movement is that they have not given attention to these very weighty pointers and sign posts. M.H.Saiyid has left them behind perhaps as the most original source, seen by and printed during the Quaid´s life time in 1945. The only exception who, during the freedom Movement and after freedom, continued this intellectual pursuit was G.A. Parwez. Had it not been for his literature this paper would never have been written and the truth would have eluded me.Now, the point is, what was it that Iqbal wanted ? What he wanted is spread out copiously in his poetic works and lectures and statements; but the whole thing is beautifully expressed and summarized in his 1930 address at Allahabad. Politically, this address is enough to immortalize him. Although passing remarks have been made by some historians, no comprehensive attempt has been made to project this great contribution to human thought and systems. So inspite of Ayesha Jalal´s repeated insistence that Pakistan in the " Lahore Resolution " was never defined, I

ent of British Imperialism. The age old Anglo- alliance is of course ignored. Stanley Walport his " Jinnah of Pakistan" has woven a thread of Jinnah's "egoism" into it. He contends that since he could not be the supreme leader on an All-India basis with a big Hindu majority, he launched a separate movement as the leader of the Muslims, only to satisfy his ego. Although a big ballyhoo was raised against Walport's passing reference to the fact of Jinnah sipping a little wine now and then, the pious ones have not taken any note of this serious misreading of the situation. As far Ayesha Jalal, in her " Sole Spokesman" she has crossed all limits. She concludes that Jinnah really did not want partition and he stood for the" Grouping System " in the Cabinet Mission Plan as the only " way to prevent partition." Jinnah's statement that " Grouping System " was a stepping stone towards Pakistan, of course has not been deemed relevant to be quoted in her text !According to Ayesha Jalal the strategy of Jinnah was to bring about " an eventual union of India on the basis of Pakistan and Hindustan." In other words Pakistan's existence today is in spite of Jinnah's ultimate intentions to the contrary. This places us all in a ludicrous situation indeed. No wonder the Indians gleefully quote this book but no Pakistani critic has publicly taken note of this denigrating attack on the Quaid and our very existence. On the contrary recently in the gathering of intellectuals of Lahore it was claimed that the book has been well received, and no body raised an eyebrow.

As I said earlier all this confusion arises because Iqbal's and Jinnah's coming together in thought and deed after 1930 has not been researched enough. It is noteworthy that one biographer Matlub-ul-Hassan Saiyid, private secretary to Quaid-e-Azam, whose book " Muhammad Ali Jinnah (a political study)' published in 1945 and seen by the Quaid has given, very naturally and obviously, an adequate reference for future research to the togetherness of Jinnah and Iqbal. During the mid-thirties when Quaid-e-Azam was trying to organize the launching of the Pakistan Movement on a mass scale he was pained to note that Muslims were either the camp followers of the Congress or the bootlickers of the British. " But in the midst of all this darkness" says M.H.Saiyid" there shone a flickering light in Lahore; he was the only consolation of Jinnah. A great philosopher, whom India

international reputation of an ideologically schizophrenic society.

To begin with, even Pakistani historians, political commentators and biographers do not see beyond Hindu mentality and Hindu prejudices as the cause of partition.. I wonder if we realise that this thesis has at least two far-reaching implications. Firstly, to try to build something on the foundations of fear and insecurity is bound to be negative and hence a weak structure. Secondly, supposing for the sake to argument it is presumed that Hindus were generous or are ready to change their attitude today and give us absolute guarantees of security, would there have been no Partition, or would we give up Pakistan today ? It may be of historical interest to note here that there were about a dozen different schemes of partitioning India prior to what Iqbal said in his 1930 Address. Excepting for some close students of history, this fact is generally unknown. The reason for this is that these schemes were the result of fear and insecurity. Iqbal stands out and gains immortality because his plan was positive, healthy and for humanity at large. Though no Indian Hindu can be really proud of the track record of narrow and bellicose attitude before or after independence towards minorities or immediate neighboring countries, the fact remains that Jinnah's own statement is on record that the Muslim League was never an anti-Hindu organization and neither was Pakistan the result of Hindu prejudice. Commenting on Iqbal's speeches and statements Shamloo writes in his preface that the demand for a separate Muslim State was " not as an escape from Hindu domination...." Shamloo's comment is particularly significant because it was written in 1944 when the Pakistan Movement was in full swing and he knew what he was talking about. After independence, G A Parwez is the only intellectual who has dealt exhaustively with the thesis . In a nutshell his stand is that the Pakistan Movement was not basically anti-Hindu or anti- British or anti-Anybody, rather it was a crucial Islam vs Islam struggle. (More will be said about it later).

My concern is that the above mentioned negative base publicised by us has already cast aspersions on the personality and motives of the Quaid-e-Azam. The Indians and some amongst us as well stigmatize him as

Conference..... The Mussalmans were like dwellers in No Man's land.... I felt disappointed and so depressed that I decided to settle down in London. Not that I did not love India but I felt so utterly helpless." At this stage a very brief resume' of Jinnah's pre -1930 period would be in order. His objectives till then were very clear to him. He was a staunch believer in Indian Nationalism and the establishment of an Indian Nation-State, a geographical and racio-lingual entity, a concept that was at its height all over the world at the time and still is especially in the Third World. However Jinnah was also convinced that no nationalism can work any where unless the minorities, (in this case, the Muslims, Sikhs, Parsis, Christians and Untouchables) felt absolutely secure vis-a-vis the majority of Hindu population in the new dispensation. Thus he was not merely the champion of his own community but every deprived and insecure individual. By 1930 he failed to achieve this, hence his acute disappointment. Now, who and what pulled Jinnah out of his disappointment, depression and helplessness and lured him back to India in 1934 ? It is obvious that unless he had found an alternate objective, some solution to the Indian tangle, or some vision to beckon him into the future he would not have returned. I repeat that he would not have returned even though he would have continued to suffer for India, pining away in self-imposed exile in London. Aziz Beg and others have mentioned Liaquat Ali Khan, Sir Muhammad Yamin Khan, Begum Shah Nawaz and Abdul Matin Chaudhery, all of whom pleaded with Jinnah to return. Surely this was so, this is factual. But strangely enough Allama Iqbal's name is bypassed. I take this bypass very seriously because my contention is that Iqbal alone gave Jinnah an alternative, a new vision, converting him from a narrow Indian nationalist into a Quranic Universalist over a period of at least four years. I am convinced this conversion and this alone filled him with hope again, returning to India with renewed enthusiasm and alacrity. Thus the year 1930 - 1935 is a sort of watershed between his first phase 1906 - 1930 and the second phase from 1935 to 1948. It is because we intermingle these two phases and because this watershed period is inadvertently or otherwise not comprehensively explained and the deeply significant duo of Jinnah and Iqbal not recognized that an unfortunate confusion has arisen, giving us an

AN EXERCISE IN SELF ANALYSIS

BY

SHAMIM ANWAR

The significance of the " Lahore Resolution" lies in the confidence of the All-India Muslim League, under the guidance of the Quaid-e-Azam, to be able to articulate its goal and rally Muslim India under one flag and on one platform. After this it was able to, with greater confidence, throw a challenge to the British and the various forces within India, Hindu and non-Hindu, that the Muslim league alone was the sole representative of Muslim India. This claim along with the "Lahore Resolution" was no ordinary political strategy; it embodied within itself great portends in the times to come for humanity at large. Today this vision is totally out of focus and out of sight, and seen in the context of near collapse of communist economy and structure, and faced with the inhuman impact inherent in the capitalist economy as the only alternative available to socialism, the failure of Pakistan to objectify all that the "Lahore Resolution" embodied individually and collectively into our socio-economic set up, is a clossal human tragedy . I shiver at the Nature's backlash in failing in our responsibilities.

My main concern today is as to what the "Lahore Resolution" has come to mean to different people, and according to my understanding (and I stand corrected for none is infallible) where and why we have gone amiss.

As a student of history I have stood surprised before historians of the Pakistan Movement and biographers of the Quaid-e-Azam at a very serious lacuna in their writings. Whether they are trained historians such as I.H Qureshi and Abdul Hamid or political narrators and spectators like Jamil-ud- Din Ahmed, or even participants like Chaudhery Khaliq-uz-Zaman, they all have missed the point.Three of the latest biographers, Stanley Walport, Aziz Beg and Ayesha Jalal, and even an earlier one, G. Allana are no where near the rationale behind the Pakistan Movement. The lacuna in their research is the most vital period of Jinnah's political life - the years between 1930 and 1935. In Jinnah's own words : " I received the shock of my life at the meetings of the Round Table